133

سلسلہ ندوۃ المصنفین دہلی

(۱۱)

وحیِ الٰہی

تالیف

مولانا سعید احمد ایم، اے

قیمت غیر مجلد
3/-/-

ندوۃ المصنفین دہلی

قیمت مجلد
4/-/-

سلسلہ ندوۃ المصنفین

(۱۱)

وحی الٰہی

مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب، جس میں وحی اور اس سے متعلقہ مسائل کے تمام گوشوں پر وقت کے جدید اسلوب میں دلپذیر بحث کی گئی ہے۔

تالیف

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم، اے

مدیر برہان

ندوۃ المصنفین اردو بازار

دھلی

طبع دوم

جمادی الاخریٰ — مارچ

سنہ ۱۳۷۱ھ — سنہ ۱۹۵۲ء

قیمت — مجلد — چار روپے

" — غیر مجلد — تین روپے

مطبوعہ اشوکا پریس دھلی

فہرست مضامین وحی الٰہی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دنیا میں سینکڑوں سوالات ہیں جن کے جواب میں انسان سب کچھ کہنے کے بعد آخر امر ایک ایسے مرحلے پر پہونچتا ہے کہ پھر اس کے لئے جواب کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہاتھی اس قدر فربہ اور توانا کیوں ہے؟ چیونٹی کیوں اتنی نحیف و زار ہے؟ آم کے درخت پر آم ہی کیوں لگتے ہیں جامنیں کیوں نہیں پیدا ہوتیں! غم سے رونا اور خوشی سے ہنسنا ہی کیوں آتا ہے اس کا برعکس کیوں نہیں ہوتا؟ یہ اور اس طرح کے سینکڑوں سوالات ہیں جن کے جواب کا آخری مرتبہ یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کو اشیاء کے طبعی خواص اور ان کے نوعی مختصات پر محول کر دیا جائے پھر اگر اس کے بعد بھی یہ سوال کیا جائے کہ اس شے کی یہ طبعی خاصیت کیوں ہے اور یہی کیوں ہے کوئی اور چیز کیوں نہیں؟ تو اس کے جواب میں ایک ملحد کہے گا کہ مادہ کی ترکیب اسی طرح ہوئی ہے۔ لیکن موحد جواب دیگا کہ خدا نے ہر شے کی صورتِ نوعیہ میں ایک الگ خاصیت رکھی ہے۔ جواب دونوں کے مختلف ہوں گے لیکن ہر ایک کا یہ جواب ایک آخری جواب ہوگا کہ اگر اس کے بعد بھی سائل "کیوں" سے سوال کرے تو اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

وحی کا مسئلہ اسی طرح کے مسائل میں سے ہے۔ اس کی حقیقت کے سمجھانے میں ہم بتا سکتے ہیں کہ خدا کلام کرتا ہے۔ خاص خاص انسان (انبیاء) اس کا کلام سنتے اور سمجھتے ہیں اور ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان دو دعووں پر جو عقلی اعتراضات کئے جائیں ان کو رفع کر دیں، لیکن

اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص "ایسا ہی کیوں ہوتا ہے" کہہ کر ہم سے سوال کرے گا تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ اچھا پہلے تم ہمارے ہزاروں "کیوں" کا جواب دیدو، پھر ہم بھی تمھیں سمجھا دیں گے کہ خدا انبیاء میں ہی کیوں کلام ربّانی کو سمجھنے کی استعداد رکھتا ہے ہمہ شما میں کیوں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔

زیرِ نظر کتاب میں وحی الٰہی پر جو بحث کی گئی ہے اس کا مقصد انھیں سوالات کا جواب دینا ہے جو واقعی ایک طالب تحقیق کے دل میں اس مسئلہ پر غور کرنے کی راہ میں پیدا ہو سکتے ہیں ان کے علاوہ وہ لوگ جو از راہ بغض وعناد اپنے "کیوں" کا سلسلہ کہیں ختم ہی نہیں کرتے وہ اس کے مخاطب نہیں ہیں۔

ان اوراق میں کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بیان کردہ حقیقت وحی کو عقلی اور نقلی حیثیت سے عام فہم اندازِ بیان کے ساتھ پیش کر دیا جائے یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہو سکی ہے؟ اس کا فیصلہ ارباب نظر و خبر کریں گے۔ واللہ ھو المستعان وعلیہ التکلان

سعید احمد اکبر آبادی
ندوۃ المصنفین دہلی
۳۱ر اگست ۱۹۴۱ء

ظلال
۱۵/۱۰/۸۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

وحی کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ زیورِ علم وعقل سے آراستہ کیا اور اس نے انسان کے جسمانی نشو ونما اور اس کی مادی زندگی کی ترقی وفلاح کے لئے کارگاہِ ہست وبود کو رنگ رنگ کے نقش ونگار سے سجایا اور ابن آدم کی تربیت وکامرانی کے لئے ایک مخصوص نظام کے ماتحت قطعی وحتمی وسائل معیشت پیدا کئے، چنانچہ وہ پانی پیتا ہے، ہوا میں سانس لیتا ہے۔ بادلوں سے بارش ہوتی ہے جو اس کے کھیتوں اور باغوں کو سرسبز وشاداب کر دیتی ہے اور جس سے اناج اور پھل پیدا ہوتے ہیں، آگ سے وہ اپنی غذا تیار کرتا ہے۔ آفتاب کی دھوپ سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں جن کی تخلیق میں انسان کی صنعت وحرفت کو کوئی دخل نہیں ان پر ہی حیاتِ انسانی کے قیام وبقا کا دار ومدار ہے یہ تمام اشیاء وہ ہیں جن کو مادی زندگی کے قدرتی وسائل وذرائع کہا جاتا ہے، لیکن اس مادی زندگی سے بڑھکر انسان کی ایک اور زندگی ہے جسکو روحانی اور اخلاقی زندگی کہتے ہیں اور اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ یہی وہ اصل حیات ہے جس پر انسان کی اجتماعی زندگی کا صالح اور درست نظام قائم رہ سکتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان کی تمام تمدنی ترقیات، عمرانی ایجادات واختراعات اور عقلی تحقیقات واکتشافات

انسانیت کی تعمیر میں مفید ثابت ہونے کے بجائے خود اس کے لئے سم قاتل بن جائیں اور اس کی سوسائٹیاں وحشیوں اور درندوں کے مہیب ریوڑ کی شکل میں تبدیل ہو کر رہ جائیں جس طرح پورے نظامِ شمسی کے قیام و بقا کا دار و مدار اجرامِ فلکی کے باہمی جذب و انجذاب پر ہے ٹھیک اسی طرح انسانی سوسائٹی کے نظم و نسق اور اس کی فلاح و نجاح کا انحصار حاسۂ اخلاقی یا روحانی اعمال و ضوابط پر ہے[1]۔

اس بنا پر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ رب العالمین جس نے انسان کی مادی و جسمانی زندگی کے قرار و قیام کا خود تکفل کیا۔ اس کے لئے ایسے قدرتی وسائل و ذرائع پیدا کئے جن کی صنعت و تخلیق میں انسان کے اپنے دست ایجاد کو مطلقاً دخل نہیں ہے۔ وہ ہیں اخلاقی اور روحانی زندگی کے ایسے قدرتی اصول و آئین نہ بناتا جو صالح تمدن کے اساس و بنیاد بنیں اور جو قطعی و حتمی ہونے کی وجہ سے ہر ملک اور ہر زمانہ میں ہر شخص کیلئے لائقِ عمل اور درخورِ قبول و پذیرائی ہوں اور ان میں کسی کے لئے اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔

عقل کی کوتاہی کہا جا سکتا ہے اس طرح کے اصول و ضوابط کے لئے یہ کیا ضروری ہے کہ وہ خدا کے بنائے ہوئے ہوں اور اس نے ہی انسان کو ان کی تلقین کی ہو جس طرح انسان اپنے رہنے کے لئے مکانات بناتا ہے۔ گرمی سردی سے محفوظ رہنے کی غرض سے اپنے لئے کپڑے بنتا اور تیار کرتا ہے اور اسی طرح کی ہزاروں صنعتیں اس نے اپنے نفع کے لئے ایجاد کر رکھی ہیں، وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ اپنے لئے اخلاقی ضوابط و قواعد بنائے اور اپنی روحانی تشنگی کو فرو کرنے کے لئے خود ہی کوئی نسخہ کیمیا تجویز کرلے، عقل جس طرح مادی ترقی کی راہ میں رہنمائی کرتی ہے، اخلاق اور روحانیت کے میدان میں بھی وہ اسی طرح شمع ہدایت

---

[1] ڈاکٹر اقبال مرحوم نے یورپ کی عقلی ترقیات کا اسی بنا پر نہایت بلیغ پیرایہ میں ماتم کیا ہے کہ وہاں ان سب ترقیوں کے باوجود اخلاق و روحانیت کا فقدان ہے اور اس لئے انسانی زندگی کا شیرازۂ اطمینان و سکون حد درجہ پراگندہ و پریشان ہے فرماتے ہیں

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

بن سکتی اور اس کا ناخن تدبیر دونوں جگہ مشکل اور پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی میں کارگر ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ کسی انسان کی عقل کتنی ہی کامل و مکمل ہو نقص سے مبرا نہیں ہو سکتی۔ انسان خود اپنی فطرت وطبیعت کے اعتبار سے ناقص وغیر مکمل ہے۔ اس بنا پر اس کی کوئی قوت بھی خواہ ظاہری ہو یا باطنی، مادی ہو یا روحانی، من کل الوجوہ کامل نہیں ہے۔ ہر معاملہ میں صحت کے ساتھ خطا، کمال کے ساتھ نقص اور تذکر کے ساتھ سہو ونسیان کا خدشہ لگا ہوا ہے اور کیوں نہ ہو امکان وحدوث کی ظلمت کے ساتھ کمالِ بے خطا کا نور جمع کس طرح ہو سکتا ہے جس طرح انسان رنگ اور شکل میں ایک دوسرے سے متبائن ہیں ٹھیک اسی طرح اپنے قوائے فکریہ وباطنیہ کے لحاظ سے بھی وہ مختلف اور ایک دوسرے سے جدا ہیں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی خوش نصیب عقل حقیقت کے بحر ناپیدا کنار میں غوطہ زنی کرکے صداقت وحقانیت کے چند آبدار موتی حاصل کرلے لیکن اس کے پاس وہ قوت کہاں ہے جس سے وہ تمام دنیا کو اس صداقت کا معترف بنا سکے۔ کوئی انسانی اختراع وایجاد خواہ کتنی ہی حقیقت سے قریب ہو اختلاف کی گنجائش سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ آج تک دنیا کی ممتاز عقلیں بھی کسی ایک مسئلہ پر متفق الرائے نہ ہو سکیں۔ فلسفہ یونان کے جو بنیادی نظریئے تھے اور جو قرنہا قرن تک عالم میں مقبول ورائج رہے آخر آج موجودہ فلسفہ یورپ نے ان کو پرزہ پرزہ کرکے فضا میں منتشر کردیا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ آج فلسفۂ حال کی عمارت جس بنیاد پر کھڑی ہے مستقبل میں کوئی قوم اپنے جدید نظریات وافکار کی قوت سے اسے پاش پاش نہیں کردیگی اور اس عمارت کے کھنڈروں پر ایک نئے نظام فکر وعمل کی دنیا نہیں بسائیگی۔ قرنوں اور صدیوں کے بعد جو کچھ ہوگا اسے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن اتنا تو اب بھی دیکھا جارہا ہے کہ فلسفۂ جدیدہ کی شاندار عمارت کو ارتیاب وشک کا گھن ابھی سے لگنا شروع ہو گیا ہے۔ مولانا عبدالباری ندوی استاذ فلسفہ جدیدہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن "فہم انسانی" کے مقدمہ میں اس رازِ سربستہ کا افشا اس طرح کرتے ہیں۔

"اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد جدید فلسفہ کی تاریخ زیادہ تر نام بدل کر کھلے یا چھپے اقرارِ جہل کی تاریخ بن کر رہ گئی، لاک کے یہاں یہ اقرار حسیت کے نقاب میں ہے اور برکلے کے ہاں ادعائے تصوریت کے مگر اتنی باریک اور شفاف کہ روپوشی سے زیادہ رونمائی کی زینت ہے آخر برکلے کے بعد ہی ڈیوڈ ہیوم نے اس رونما نقاب کو بھی تار تار کر دیا اور نہ صرف جہلُ ارتیابیت کا کھل کر اقرار کیا بلکہ اپنے کو ارتیابی ہی کہلانا پسند کیا۔

فلاسفہ کا اعتراف عجز و نارسائی

عقلِ انسانی کی کوتاہی اور اس کے عجز و قصور کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ وہ عظیم المرتبت فلاسفہ عالم جن کے فلسفیانہ افکار و نظریات عقل و فکر کی تاریخ ارتقاء کا آخری نقطۂ عروج مانے جاتے رہے ہیں جب عالمِ حقیقت کی لامحدود وسعتوں میں انھیں قدم قدم پر حیرت و گمشدگی سے سابقہ پڑا تو خود انھیں بھی بجز اس کے کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ وہ برملا عقل کی کوتاہ بینی اور فکر کی نارسائی کا اعتراف کریں سقراط کا یہ مقولہ حدِ تواتر تک مشہور ہے "ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے" انگلستان کا مشہور فلسفی ڈیوڈ ہیوم صاف لفظوں میں اقرار کرتا ہے کہ

"انسان عقل مخلوق ہے، اور اس لحاظ سے علم اس کی خاص دماغی غذا ہے لیکن ساتھ ہی انسانی ذی عقل و فہم کے حدود اتنے تنگ ہیں کہ اس باب میں اس کو وسعت و اذعان دونوں حیثیات سے بہت ہی کم اپنے فتوحات سے تشفی نصیب ہو سکتی ہے"۔

"فہم انسانی" میں ہی ایک اور جگہ فلسفہ کا اس طرح مذاق اڑاتا ہے۔

"مکمل سے مکمل فلسفۂ طبعی بھی صرف یہ کرتا ہے کہ ہمارے جہل کو ذرا اور دور کر دیتا ہے جس طرح مکمل سے مکمل فلسفہ مابعد الطبیعات اور اخلاقیات کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ ہمارے اس جہل کے وسیع حصوں کی پردہ دری کر دیتا ہے" مطلب یہ ہے کہ فلسفہ اسرارِ کائنات کی نہیں صرف ہمارے جہل کی پردہ دری کرتا ہے اس کا حاصل اگر کچھ تھا یا ہو سکتا ہے تو انسان

کی کمزوری اور کوتہ چشمی کا تماشا دیکھنا دکھانا جس سے بھاگنے کی کوشش کے باوجود بار بار دوچار ہونا پڑتا ہے۔"

طیس
ہیوم تو خیر ارتیابی تھا۔ ہر چیز کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا تھا، مادہ پرستوں کا ابوالاباء دیمقرا طیس متولد ۴۶۰ ق م تک کا قول ہے کہ کوئی بات سچ نہیں اور اگر ہے تو ہم کو معلوم نہیں۔[۵]

پس جب عقل خود ناقص ہے تو کسی صحیح نتیجہ تک پہونچنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جائیں گے یعنی قیاس استقرا اور تمثیل ان کی نسبت کیونکر بوثوق کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی صحیح اور یقینی نتیجہ تک ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کے یقینی علم کے لئے مشاہدہ سے بڑھ کر کوئی اور قوی دلیل نہیں ہو سکتی، لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ قدیم فلاسفہ میں تو لا اور یہ کا ایک مستقل گروہ تھا ہی جو کہا کرتا تھا کہ ہمیں کسی شے کی کوئی حقیقت معلوم نہیں۔ یورپ کے جدید فلاسفہ کی صف میں بھی برکلے جیسے فلسفی نظر آتے ہیں جو کہتے ہیں کہ کسی شے کا وجود صرف وہی ہے جو ذہن میں ہے اس کے علاوہ وجود خارجی کے کوئی معنی نہیں۔ اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان فلاسفہ نے جو کچھ کہا وہ ٹھیک ہے۔ بلکہ مدعا صرف یہ دکھانا ہے کہ اگر عقل کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور خدا کی ہدایت اس کی دستگیری نہ کرے تو خود اس کی کوششیں بسا اوقات فرطِ حیرت کی ناکامی ومایوسی پر منتہی ہوتی ہیں اور ادراکِ حقیقت کی کسی روشنی تک پہونچنے کے بجائے وہ لاعلمی و نادانی کی تاریکیوں میں خود اپنے آپ کو بھی گم کر دیتی ہے۔

اس موقع پر اتنی بات اور یاد رکھنی چاہیئے کہ جب طبیعات میں عقل کی کوتاہ رسی کا یہ عالم ہے کہ وہ قطعی طور پر کسی چیز کی ذاتیات اور عرضیات میں بھی امتیاز نہیں کر سکتی اور اسی بنا پر اربابِ منطق

---

[۵] یہاں یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ اس باب میں جن فلاسفہ کے اقوال نقل کئے گئے ہیں وہ سب فہم انسانی سے ماخوذ ہیں جو پروفیسر عبدالباری ندوی کے قلم سے ڈیوڈ ہیوم کی کتاب ہیومن انڈرسٹینڈنگ کا نہایت عمدہ ترجمہ ہے اس کے علاوہ موصوف کی دو اور کتابیں "برکلے" اور "مبادی علم انسانی" جو برکلے کی کتاب کا ترجمہ ہے یہ دونوں بھی پیش نظر رہی ہیں

تسلیم کراتے ہیں کہ کسی چیز کی بھی حدِ تام بیان کرنی ناممکن ہے، تو ظاہر ہے مابعد الطبیعیات میں اس کی لنگ پی کا کیا حال ہوگا اور چونکہ فضائل اخلاق اور روحانی کمالات کا تعلق ایک بڑی حد تک حقائق مابعد الطبیعیات کے تصور سے ہے اس لئے عقل اس راہ میں ہماری کامیاب رہنما ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ ہم اس پر اعتمادِ کلی کر سکتے ہیں۔

عقل اور دل اس مقام پر مزید توضیح و تشریح کی غرض سے اتنا اور یاد رکھئے کہ انسان کو جتنے معاملات پیش آتے ہیں، ان کا تعلق صرف عقل سے ہوتا ہے یا فقط دل سے اور یا دونوں سے اور یہ واقعہ ہی کہ انسانی زندگی کا قیام و بقا اور اس کی روحانی و اخلاقی دنیا کا نظم و نسق مبنی ہے اس بات پر کہ انسان عقل اور دل دونوں سے کام لے، کیونکہ جس طرح عقل مصدرِ شعور و احساس ہی۔ اسی طرح دل جذبات و عواطف کا سرچشمہ ہی اگر ہم عقل (Reason) کے ہی تابع فرمان ہو جائیں اور دل (Feeling) کو ہم پر کوئی دسترس حاصل نہ ہو تو ہم اس فلسفی کی طرح ہو کر رہ جائیں گے جس کو شادی میں غم اور غم میں شادی کی تصویر نظر آتی ہے اور جو اپنی ہستی کے قطرہ کو وجودِ ابدی کے بحر ناپیدا کنار میں فنا کر دینے کے بعد ہر قسم کے فعل و عمل سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم عقل سے بالکل صرف نظر کر لیں اور اپنے تمام معاملات اور افعال و اعمال دل کے میلانات و عواطف کے تابع بنا لیں تو اس کا انجام بھی بجز تباہی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا اس وقت ہماری مثال انتہائی عیش پرست اور ظالم و جابر انسان کی سی ہوگی۔ یا پرلے درجہ کے مغلوب الجذبات نرم خو اور رحم آگیں شخص کی سی۔ غرض یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں خیالات و احساسات کا توازن مفقود ہو کر انسانی اجتماعیات کے شیرازہ کو درہم برہم کر کے رکھ دیگا۔ اس لئے ضرورت ہی کہ دونوں میں ارتباط و التیام ملحوظ رکھا جائے لیکن محبت کے عام نفسیاتی قانون کے مطابق دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کی طرف نسبتہً زیادہ مائل ہونا چاہیے۔ اس مرحلہ پر ہمارا دعویٰ ہی کہ عقل کو ایک بڑی حد تک "ادب خوردہ دل" ہونے کی ضرورت ہی جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے عقلِ محض کی رہنمائی ہمارے لئے کشودِ کار کا قابلِ اطمینان ذریعہ نہیں۔ البتہ وہ

عقل جو علامہ اقبال مرحوم کے بقول "ادب خوردگی دل" کے زیور سے آراستہ ہے وہ ہماری روحانی تشنگی کو فرو کرنے کا بہت کچھ سامان رکھتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

نقشے کہ بستہ ایم ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

ذیل کے شعر میں بھی انھوں نے اسی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

فلسفۂ اشراق جن لوگوں نے تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جب مسیحیت اور فلسفہ محض دونوں انسان کی روحانی تشنگی کے فرو کرنے میں ناکام ثابت ہوئے جس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت عقل کو مطمئن کرنے میں ناکامیاب رہی اور فلسفہ روح اور دل کے لئے کوئی سامانِ تسکین فراہم نہیں کر سکا تو افلاطون کے متبعین نے فلسفہ اور مذہب دونوں کی آمیزش سے ایک معجون مرکب تیار کی جس کا نام فلسفۂ اشراق Neo-Platonism رکھا گیا[1] اس کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ طبیعاتی مسائل و مباحث کے ساتھ ساتھ اخلاقیات اور الٰہیات اور روحانیت کے مسائل بھی اس میں شامل تھے۔ فلسفہ کے اس اسکول کا بانی فلاطینس (Plotinus) تھا جو ۲۰۵ء میں مصر میں پیدا ہوا اور ۲۷۰ء میں روم میں انتقال کر گیا۔

اسباب و علل خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس فلسفہ کو مشرق میں اور مغرب میں دونوں جگہ بہت فروغ ہوا اور غالباً یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ دنیا کے دل و دماغ پر تو اس فلسفہ کا اثر اس زبردست استیلا ہوا کہ مذہبی عقائد کی مضبوط بنیادیں تک متزلزل ہو گئیں۔ لیکن چونکہ اس فلسفہ کا تمام تار و پود عقل کی کم نگاہیوں سے ہی تیار ہوا تھا اور اگرچہ اس میں ضمیر (کانشنس) کی پکار کو بھی دخل تھا لیکن وہ مغلوب تھی اور غلبہ عقل کو ہی تھا اس لئے معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کے میدان میں انھیں قدم قدم پر ٹھوکریں کھانی پڑیں اور یہ دانشوران حکمت و دانائی جانفرسا تگ و دو کے بعد بھی اس سرچشمۂ ہدایت تک نہ پہنچ سکے جو روح اور دل کے

---

[1] فلسفۂ اشراق پر مفصل معلومات کے لئے دیکھو Encyclopaedia of Religion & Ethics V.9, PP: 307 - 319

لئے واحد سرمایہ تسکین ہے۔

فلسفۂ اشراق خدا کو مانتا ہی نہیں، بلکہ وہ اس کو تمام کائنات میں جاری وساری مانتا ہے اس کے نزدیک خدا منبع خیر ہے اور مادہ مخزنِ شر وظلمات اس کے اذعان ویقین میں خدا حقیقتِ واحدہ ہے اور انسانی روح اس کا پرتو اس عقیدہ کے ساتھ ساتھ فلسفۂ اشراق روحانیت، اخلاق، تزکیۂ باطن اور تصفیۂ نفس کی طرف بھی دعوت دیتا ہے اور انسان کو لذائذ جسمانی ترک کر کے تقویٰ وطہارت کی زندگی بسر کرنے پر ابھارتا ہے یہ سب کچھ سہی لیکن اصل یہ ہے کہ چونکہ اس فلسفہ کی بنیاد کسی خدائی قانون (وحی الٰہی) پر نہیں تھی اور یہ محض عقل کی لاٹھی کے سہارے کھڑا ہوا تھا۔ اس بنا پر خود خدا کی صفات وذات کی نسبت اس فلسفہ نے ایسی موشگافیاں کیں کہ انھوں نے انسان کی روح کو دلاسا دینے کے بجائے اسے ایک اور ہولناک ورطۂ حیرت وتذبذب میں پھنسا دیا مثلاً اس فلسفہ نے بتایا کہ۔

(۱) خدا علۃ العلل ہے اور چونکہ علۃ تامہ سے معلول کا صدور بالاختیار والارادہ نہیں ہوتا بلکہ بالاضطرار ہوتا ہے اس لئے عالم کی تخلیق بھی خدا سے اضطراراً ہوئی ہے، اس میں اس کی مشیت اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں، اس کی مثال بالکل آگ کی سی ہے کہ جب وہ پائی جائیگی تو حرارت پیدا ہوگی ہی، خواہ آگ کے لئے ارادہ ہو یا نہ ہو۔

(۲) خدا کی ذات اس قدر ارفع واعلیٰ ہے کہ ہم اس کی طرف کسی صفت مثلاً علم، ارادہ اور خیر کا بھی انتساب نہیں کر سکتے، حد یہ ہے کہ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ وجود رکھتا ہے۔ کیونکہ ہر موجود کا تصور ممکن ہے اور خدا کا تصور ہو ہی نہیں سکتا (لَا یُحَدُّ وَلَا یُتَصَوَّرُ)

(۳) انسان کی روح اگر حسی لذتوں میں مبتلا رہے گی تو وہ قالب بدلتی رہے گی خواہ وہ کسی انسان کا ہو یا حیوان کا یا نباتات کا۔

غرض یہ ہے کہ اس فلسفہ نے کہیں درپردہ لاادریت کی تلقین کی اور کہیں ویدانت فلسفہ کے

دیکھا دیکھی تناسخ کا اقرار کیا۔ یہ لوگ چلے تھے حق کی تلاش میں، لیکن جب عقلِ محض کی قیادت راہ طلب کی جانگسل صعوبتوں کی حریف نہ بن سکی تو انجام کار حضرت موسیٰ کی قوم کی طرح خود اپنے وجود کو بھی وادیٔ حیرت میں گم کر کے بیٹھ رہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ یہ فلسفہ روحانیت اور اخلاق کے چند در چند مواعظہ حسنہ کے باوجود تمام دنیا کا تو کیا ذکر ہے کسی ایک انسانی سوسائٹی میں بھی عظیم الشان روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا نہیں کر سکا، بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس فلسفہ نے انسان کو دماغی بلند پروازیوں میں مشغول کر کے اسے عملی جد وجہد سے محروم کر دیا اور اس کی عملی قوتوں کو اس درجہ مضمحل بنا دیا کہ وہ تقریباً از کار رفتہ ہو کر رہ گئیں۔ مرزا غالب نے شاید اسی قسم کے لوگوں کی نسبت کہا ہے۔

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت　　دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

موجبات تسکین و یقین | عقل منطق اور فلسفہ ان سب دروازوں سے مایوس لوٹنے کے بعد پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھا بتاؤ اطمینان و سکون کا وہ خزانہ کہاں ہے جو انسانیت کی روحانی طلب کو سکون عطا کر سکے قبل اس کے کہ آپ اس کا جواب معلوم کریں، یہ جان لینا ضروری ہے کہ یقین کی ماہیت کیا ہے؟ اور یہ کس طرح پیدا ہوتا ہے۔

کم و بیش تمام علماء نفسیات نے یقین کی ماہیت اور اس کے اسباب و علل پر بحث کی ہے لیکن نفس یقین کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہے بلکہ اسکی مختلف قسمیں ہیں مثلاً منطقی یقین Logical Certainty نفسیاتی یقین (Psychological Certainty) اور مذہبی یقین (Religious Certainty) اور یقین کا تحقق انھیں اقسام میں سے کسی ایک قسم کے ضمن میں ہوتا ہے، ان اقسام کی تعریفیں جدا جدا ہیں لیکن ان سب میں مابہ الاشتراک یہ ہے کہ یقین ایک طرح کا نفسی میلان ہے جو خاص خاص موثراتِ خارجی و ذہنی کے زیر اثر انسان کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے[۵]۔ اس نفسی میلان کو پیدا کرنے کے لئے نہ فلسفیانہ اور منطقی

[۵] تفصیلی معلومات کیلئے دیکھو Encyclopaedia of Religion & Ethics V. 10 pp. 320 to 330

دلائل کی ضرورت ہے اور نہ ریاضی واقلیدس کی بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ میلان نہ علم پر موقوف ہے اور نہ جہل پر اس کا انحصار نہ سچ پر ہے اور نہ جھوٹ پر۔ فرض کیجئے ایک ڈاکٹر ہے جسے آپ جانتے ہیں کہ اس نے اب تک جتنے علاج بھی کئے ہیں ان میں وہ ناکام رہا ہے اس بنا پر اگر آپ کا کوئی عزیز بیمار ہو جائے تو چونکہ آپ کو اس ڈاکٹر کی نالائقی کا یقین ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص آپ کو اس ڈاکٹر کے علاج کا مشورہ دیگا بھی تو آپ فوراً انکار کر دیں گے لیکن آپ کے برخلاف ایک اور شخص ہے جو کم از کم ڈاکٹر موصوف کے بیس کامیاب علاجوں کا مشاہدہ خود اپنی آنکھ سے کر چکا ہے۔ اس لئے اگر آپ اپنے مریض عزیز کے علاج سے متعلق اس شخص سے مشورہ کریں گے تو وہ بے تامل و تردد کہے گا کہ اسی ڈاکٹر سے رجوع کیجئے کیونکہ اسے اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ کے باعث ڈاکٹر کی قابلیت و مہارتِ فن کا ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ آپ کو ڈاکٹر کی عدم قابلیت کا اس مثال سے واضح ہوا ہو گا کہ یہاں ڈاکٹر کی قابلیت کی نسبت شخص مذکور الصدر کا نفسی میلان (یقین)، اس کے تجربہ پر مبنی ہے۔

اب اس کے بعد اس پر غور کیجئے کہ تجربہ کبھی مسلسل مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے اور کبھی عمل ذوق و وجدان سے۔ آپ نے اردو شاعری میں رندِ بادہ خوار اور زاہدِ تقویٰ شعار کی نوک جھونک دیکھی ہوگی دیکھئے زاہد شراب کی برائی کا یقین رکھتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس رندِ بادہ آشام کو شراب کی جانفروزی کا اس درجہ یقین ہے کہ وہ دعویٰ سے کہتا ہے :۔

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

پھر زاہد اس کے اس یقین کو توڑنے کے لئے دلائل و براہین پیش کرتا ہے تو وہ ان کے جواب میں صرف اتنا کہتا ہے ع

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

غرض یہ ہے کہ یقین جس کی حقیقت ایک نفسی میلان کے سوا اور کچھ نہیں ہے مختلف جذبات قلبی کیفیات

کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس بنا پر کوئی ایک شخص کسی دوسرے کو اس لئے مطعون نہیں کر سکتا کہ وہ کسی چیز کی نسبت اس کی طرح یقین واذعان کیوں نہیں رکھتا ہاں لعن وطعن اور ملامت اگر ہوسکتی ہے تو وہ محض اس بات پر ہوسکتی ہے کہ اُس دوسرے شخص کے دل میں وہ کیفیت کیوں پیدا نہیں ہوتی جس کی وجہ سے دل میں اُس چیز کی نسبت نفسی میلان پیدا ہوتا، چنانچہ قرآن مجید نے ان کفار کے متعلق جو کلمۂ حق قبول نہیں کرتے تھے۔ یہ نہیں کہا کہ انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کے وحی ہونے کا یقین کیوں نہیں آتا بلکہ

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (بقرہ)

اللہ نے اُن کے دلوں اور اُن کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور انکی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

فرما کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان لوگوں میں فطرتاً اتنی صلاحیت واستعداد ہی نہیں کہ ان کے دل میں آنحضرت اور قرآن کی حقانیت وصداقت کے متعلق نفسی میلان پیدا ہو۔

اس تقریر سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یقین بذات خود کوئی مستقل چیز نہیں بلکہ وہ ثمرہ ہوتا ہے ایک خاص طرح کے طبعی وقلبی جذبات وتاثرات کا، اب اس مقدمہ کو ذہن نشین کرکے آپ غور کریں گے تو بین طور پر محسوس ہوگا کہ وحی الٰہی انسان کے دل میں جس طرح اطمینان وسکون پیدا کر دیتی ہے وہ بالکل ایک نفسیاتی طریقہ ہے اور اس لئے انسان اس پیغام ربانی کو سن کر اُس شک وتردد سے دوچار نہیں ہوتا جس کا سبب بالعموم منطقی طرز بحث واستدلال ہوتا ہے۔

مثلاً اگر اس کو یہ بتاتا ہے کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے تو وہ اس سے بحث نہیں کرتا کہ خدا کلام کرتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کرتا ہے تو کس طرح ہے؟ کیا اُس کے لئے نطق پایا جا سکتا ہے؟ کیا نطق کے لئے عضلات واعصاب کی ضرورت نہیں ہے؟ جبرئیل رسول اللہ کے قلب پر کلام خداوندی کا القا کرتے ہیں تو کس طرح؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ جانتا تھا کہ یہ مابعد الطبیعیاتی حقائق ہیں جن کی گرہ کشائی آجتک نہ کسی

کے ناخن تدبیر نے کی ہو اور نہ کر سکے، جب مشاہدات اور محسوسات کی دنیا میں ہی قدم قدم پر ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں تو عالم مجردات و معقولات کی وسعتیں کس طرح انسان کی محدود عقل میں سمٹ سمٹا کر جمع ہو سکتی ہیں اس لئے قرآن نے اس طریقہ بحث و استدلال کو چھوڑ کر ایک بالکل نفسیاتی اور بہت زیادہ موثر طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور دعوت دی کہ آپ کے ایک ایک عمل اور ایک ایک حرکت و سکون کو نہایت گہری تنقید مگر انصاف اور عدل کی نگاہ سے دیکھو، اسے جانچو، پرکھو اور بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی اُس ذات گرامی کو جھوٹ بولتے دیکھا ہو؟ کیا تمھیں کبھی ان کی کوئی حرکت مشتبہ نظر آئی ہو؟ کیا اُن کے کسی قول و فعل پر بھی تمھیں کبھی حرف گیری کا موقع ملا ہو؟ اگر ان سب باتوں کا جواب نفی میں ہو، اور یقیناً نفی میں ہو تو یقین کرو کہ جس ذات نے عمر کا بہترین حصہ (۴۰ سال) اس تقویٰ و طہارت، معصومیت اور فضائل اخلاق کیساتھ بسر کئے ہیں وہ آج بھی جھوٹ نہیں بول سکتا اور آج بھی ان کی زبانِ حق ترجمان کسی نا ملائم اور نا درست بات سے آشنا نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر چڑھ کر پہلی مرتبہ قریش کو دعوت اسلام دی تو یہی طریقہ اختیار کیا کہ اُن سے پوچھا "بتاؤ! تم مجھ کو کیا سمجھتے ہو؟ جب سب نے بیک آواز اقرار کر لیا کہ "آپ تو امین صادق ہیں، آپنے آج تک کوئی بات جھوٹ نہیں کہی"، تو آپ نے اُن تک اسلام کا پیغام جان التیام پہنچایا اور خود قرآن بھی سید کونین کی زبان اقدس سے یوں گویا ہوتا ہو۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ — میں نے تو تمھارے درمیان مدت تک عمر گذاری

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس) — ہے کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہو کہ وحیِ الٰہی پیغمبر کو ایک فاضل و کامل معلم یا ایک شفیق و عقلمند باپ کی حیثیت سے پیش کرتی ہو اور انسان کے کانشنس یا اسکے ضمیر و وجدان Inner Feeling سے اپیل کرتی ہو کہ جس طرح شاگرد وجدانی طور سے استاد پر اور بیٹا باپ پر اعتماد کلی رکھتا ہو اور اس لئے

اُستاد کی تعلیمات اور باپ کی نصیحتوں کو شک وشبہ کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ اسی طرح تمام دنیا کو پیغمبر کی ذات پر اعتماد رکھنا چاہیے اور اس کی تعلیمات وہدایات کو گوشِ حقیقت نیوش سے سُن کر حرزِ دل وجاں بنا لینا چاہئے۔

پس یہ ثابت ہو گیا کہ اصل صداقت وحقانیت اور کامل اطمینان وسکون کا سُراغ صرف وحیِ الہٰی کے ذریعہ ہی مل سکتا ہے اور انسان کی روحانی تشنگی صرف اسی سرچشمۂ ہدایت کے آبِ زلال سے بجھ سکتی ہے۔ اللہ بس ماقبی ہوس۔ "مذہبی دیوانوں" کا کیا ذکر ہے خود اُن لوگوں نے جو کرہ فلسفہ کی سب سے اونچی سطح پر نظر آتے ہیں اس حقیقت کا کھُلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔

"ہم کو حصولِ صداقت سے مایوس ہو جانا چاہئے بجز اس صورت کے کہ ہم یہ مان لیں کہ اس کا علم براہ راست خود اسی ذات کی طرف سے عطا ہوتا ہے جو اس کا ابدی سرچشمہ ہے، یعنی خود خدا کی طرف سے، اور یہی وہ آخری حل تھا جو نوفلاطینیوں نے اختیار کیا اور جسکو ارتیابیت نے ناگزیر کر دیا تھا۔ علمی تفکر کی راہ سے حصول یقین کی مایوسی ہی اس پر مجبور کر سکتی تھی کہ صداقت کو وحی کے اندر پانے کی کوشش کی جائے جو فکر سے بالاتر ہے[1]"

ایک اور فلسفی کہتا ہے۔

"انسان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں، ہاں خدا کے پاس ہے۔ اور مدعی جاہل انسان خدا سے اسی طرح سیکھتا ہے جس طرح بچہ بڑوں سے[2]"

اس جملہ میں جس طرح "بچہ بڑوں سے" کی تشبیہ نہایت بلیغ ہے۔ قائل کی مراد یہ ہے کہ جس طرح بچہ بڑوں سے کوئی بات سیکھتا ہے اور بڑوں کی عظمت وجلالت اور ان پر کامل اعتماد کی اذعانی کیفیت کے قلب پر مستولی ہونے کی وجہ سے بچہ کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خطرہ نہیں گذرتا کہ بڑوں کا سکھایا ہوا سبق

---

[1] جانٹ کی تاریخ مسائل فلسفہ ص ۱۱۴ [2] لیوس کی سوانحی تاریخ فلسفہ ص ۸۲

غلط ہوگا۔ اسی طرح انسان جب کسی بات کو اس اذعان کے ساتھ قبول کرتا ہو کہ یہ منجانب اللہ ہو تو اُسے اس وقت کسی تردد و تذبذب سے دوچار ہونا نہیں پڑتا اور وہ اپنے قلب میں اطمینان و سکون کی ایک جاں فروز کیفیت محسوس کرتا ہو۔"

ڈیوڈ ہیوم کو سب جانتے ہیں کہ ارتیابی تھا اور وحی والہام کا بھی منکر تھا لیکن پھر بھی ایک موقع پر ساز فطرت کے نغمہ کی ایک ہلکی سی آواز اُس کے زبانِ قلم سے ظاہر ہو ہی گئی۔ وہ لکھتا ہے:۔

"جہاں تک تجربہ اس طرح کے مسائل کی تائید کرتا ہے۔ وہاں تک تو یہ استدلال پر مبنی ہوتے ہیں لیکن ان کی اصلی اور محکم بنیاد وحی و ایمان پر ہے[1]"

مولانا عبدالباری ندوی نے فہم انسانی کے دیباچہ میں اسی حقیقت کو نہایت دلچسپ اور بلیغ پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"ظواہر عالم کی نسبت ہم بہت کچھ جانتے اور جان سکتے ہیں لیکن حقائق عالم کی نسبت کچھ جاننے کا دعویٰ کریں تو نرا جہل مرکب ہوگا اور بقول سقراط ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے۔ اس زندگی کو ہم چاہے جتنا سنواریں اور بنائیں لیکن اس کے آگے اور پیچھے کی اگر کچھ فکر ہو تو "اوّل و آخر ایں کہنہ کتاب افتادست" نہ پیچھے کا کچھ نشان ملا نہ آگے کی کچھ خبر دے سکتے ہیں سوائے اس کے کہ بس بیچ کے اوراق اُلٹ پلٹ کر لال بجھکڑوں کی طرح ہرن کے پاؤں میں چکّی کا پاٹ باندھتے رہئے، غرض اپنے یا کائنات کے آغاز و انجام حقیقت و ماہیت، غرض و غایت کے بارہ میں، یہ یا اس طرح کے جتنے سوالات یا ان کی تفصیلات ہوں خالص عقل و استدلال نے ان کے بارے میں کبھی اذعان و اطمینان نہیں بخشا، بلکہ فلسفہ سے انسانیت کی یہ پیاس اپنے حلق میں صرف کانٹوں کا اضافہ کرتی رہی اور جہاں انسانی عقل و فہم نے تجربہ کی راہ سے ذرا

---

[1] فہم انسانی ص ۳۳

بہک کر اس خارزار میں اپنے دامن کو الجھایا تو خود فلسفہ کی ساری تاریخ گواہ ہو کہ طفلانہ ہمت نے
دو ہی چار قدم ڈالے تھے کہ شک اور ریب، جہل اور لاعلمی کے کانٹوں نے ہر طرف سے دامن
پکڑنا شروع کیا، ایک نکلا نہیں اور دس نے پکڑا، جال کے اندر جتنا پھڑکو، وہ اتنا ہی کھال
کے اندر گھستا جاتا ہے۔

انسانیت کی بیشتر آبادی ہمیشہ اس وادی میں وحی و ایمان کی رہنمائی کو قبول کرکے چلتی رہی'
عقل کو اگر دخل دیا بھی تو زیادہ تر قبول ہی کے لئے۔ البتہ مغرب جہاں سے آفتاب نکلتا نہیں
بلکہ جہاں ڈوبتا ہو وہاں کی نئی پرانی دنیا دونوں کو وحی و ایمان سے کچھ قدرۃً بُعد رہا ہے تو
اُس کے فلسفہ کی نئی پُرانی دونوں تاریخوں کی جو کم و بیش ڈھائی ہزار سال کی وسعت میں
پھیلی ہیں، ورق گردانی کر جاؤ، جتنا آگے بڑھتے جاؤ گے اتنا ہی دانش کی جگہ نادانی اور
علم کی جگہ لاعلمی سے دوچار ہوتے جاؤ گے۔" (دیباچہ فہم انسانی)

اس حقیقت کو ایک اور مثال سے سمجھئے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے تمام مشاہدات کا تعلق بینائی سے ہے
لیکن کیا یہ صحیح ہو کہ مشاہدہ کا انحصار صرف قوت بصارت کے صحیح و سالم ہونے پر ہو؟ ہرگز نہیں! بصارت
کے ساتھ ساتھ خارجی روشنی کی بھی ایسی ہی ضرورت ہو جیسی کہ بینائی کی۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی تیز نظر ہو لیکن
اگر کوئی خارجی روشنی نہ ہو، آفتاب کی ہو، یا کسی لیمپ یا بجلی کی اور تمام فضا تاریک ہو، تو ظاہر ہے کہ یہ
تیز نظری کسی کام کی ثابت نہیں ہو گی پس اسی طرح عقل میں قدرت کی طرف سے جو قوت بصیرت ودیعت
رکھی گئی ہو وہ اپنی جگہ مسلم اور درست، لیکن جس طرح بصارت بغیر خارجی روشنی کے محض بیکار ہو۔ اسی طرح
عقل کی روشنی صرف اُسی وقت کارآمد ہو سکتی ہو جبکہ خارج میں بھی اُس کی رہنمائی کے لئے کوئی قوی روشنی
موجود ہو۔ اور یہ روشنی وہی ہے جس کو مذہب کی اصطلاح میں "وحی" کہتے ہیں۔ آیت ذیل میں اسی
کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔

هُوَالَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ	وہ (خدا) وہی ہو جو خود اور اس کے فرشتے تم پر
لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ	رحمت بھیجتے ہیں تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے نکالکر نور کیطرف
وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ○ (الاحزاب)	لے آئے اور اللہ مومنوں پر بڑا رحم کرنے والا ہے۔

بصارت اور بصیرت میں صرف ظاہر و باطن کا فرق ہی، ورنہ دونوں کا حال افادہ کے اعتبار سے بالکل یکساں ہی۔ جس طرح آفتاب سماوی کے بغیر بصارت ناکارہ ہی ٹھیک اسی طرح عقل وخرد کی بصیرت خورشید حقیقت کی جلوہ پاشیوں کے بغیر اپنی ذاتی صلاحیتوں کے باوجود قطعاً بے فائدہ ہی۔ اور اگر کوئی شخص اس روشنی کے بغیر ہی محض عقل کے سہارے چلنا چاہتا ہی تو وہ اُس بیوقوف سے کسی طرح کم درجہ کا احمق نہیں ہی، جو نہایت شدید تاریکی میں بھی اپنی آنکھوں پر اعتماد کرکے سرپٹ دوڑنا چاہتا ہی۔

ترجمان حقیقت ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہی

انجام خرد ہی بے حضوری | ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہائے بے صوت | ہیں ذوقِ عمل کیواسطے موت
دل در سخنِ محمدی بند | اے پورِ علی زبوعلی[1] چند

---

[1] مشہور مسلمان فلسفی شیخ ابوعلی سینا۔

وحی کے لغوی و اصطلاحی معنیٰ

وحی کے معنیٰ لغت میں حسب ذیل ہیں :-

الوحیُ الاشارةُ والکِتابۃُ والرسالۃُ	وحی کے معنیٰ اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا دلمیں ڈالنا
والکلامُ الخفی وکل ما القیتہ الی غیرک	چھپاکر بولنا اور جو کچھ تم کسی دوسرے کے خیالمیں ڈالو۔

اشارہ کرنا - ایک شاعر کہتا ہے :-

ترئ عینہا عینی فتعرف وحیہا   وتعرف عینی ما بہ الوحی یرجع

قرآن مجید میں ہے :-

فَاَوْحٰی اِلَیْھِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَةً وَّعَشِیًّا	تو اشارہ سے کہا انکو کہ یاد کرو صبح اور شام

لکھنا - عجاج کا شعر ہے -

حتی نحاھُم جدُّنا والناجی   لقد رِکان وحاۂ السواجی

"خط اور کتاب" لبید کا شعر ہے جو سبعہ معلقہ کے چوتھے معلقہ میں ہے -

فَمَدَافِعُ الرَّیَانِ عُرِّیَ رَسْمُھَا   خَلَقًا کَمَا ضَمِنَ الوُحی سلامُھَا

"حکم دینا" عجاج کہتا ہے -

وحی لھا القرار فاستقرّت   وشَدَّھا بالراسیات الثُّبت

"چھپاکر بات کرنا" ابو ذویب کہتا ہے :-

فقال لھا وقد اوحتُ الیہِ   اَلا لِلّٰہِ اُمُّکَ ما تعیفُ

"آواز" ابوزبیدہ کا مصرعہ ہے۔

مرتجز الجرف یوحی اعجم

لیکن اہل لغت کہتے ہیں کہ اس لفظ کے معنی دوسروں سے چھپا کر کسی سے چپکے چپکے بات کرنے کے ہیں کسائی عرب کا محاورہ بتاتا ہے "وحیتُ الیہ بالکلامِ واوحیۃ الیہ ہُوان تکلمِ بکلامِ تخفیہ من غیرہٖ" یعنی کسی سے اس طرح باتیں کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ" ابو اسحاق لغوی کہتا ہے "واصل الوحی فی اللغۃ کُلّہا اعلام فِی خفاءٍ" وحی کا اصل مفہوم تمام لغت میں چھپا کر اطلاع دینا ہے۔

قرآن مجید میں بھی یہ لفظ متعدد معنوں میں آیا ہے۔

شیطان کا وسوسہ پیدا کرنا۔

یُوحِی بعضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ وّاِنَّ الشَّیاطِیْنَ	انکے بعض بعض کو وحی کرتے ہیں اور بیشبہ شیطان
لَیُوْحُوْنَ اِلٰی اَوْلِیَاءِ ھِمْ	اپنے دوستوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتے ہیں

دل میں کسی بات کا ڈال دینا

وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی اَنْ	اور ہم نے موسیٰ کی ماں کے دلمیں یہ بات
اَرْضِعِیْہِ	ڈالی کہ تم اُن کو دُودھ پلاؤ۔

اس آیت میں بھی وحی دل میں بات ڈالنے کے معنی میں ہے۔

وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ	اور جبکہ میں نے (حضرت عیسیٰ) کے حواریوں کے دل میں
اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ	یہ بات ڈالی کہ تم مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لے آؤ

فطری حکم جس کو وحی نوعی بھی کہتے ہیں۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ	اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو وحی کی کہ تو پہاڑوں
مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا	میں گھر بنالے۔

کام پر مقرر کرنا

وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا — اور خدا نے ہر آسمان کو اُس کے کام پر مقرر کر دیا

پھر یہ فطری حکم ذی روح کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ بے جان چیزوں کے لئے بھی وحی کا لفظ فرمایا گیا ہے مثلاً اس آیت میں۔

یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَھَا بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَھَا۔ — اُس دن زمین اپنا سب احوال بتائیگی کیونکہ آپکے ربنے اس کو ان باتوں کی ہدایت دیدی ہے

چُپکے بات کرنا۔

یُوْحِیْ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ — یہ ایک دوسرے کو چکنی چپڑی باتیں وحی کرتے ہیں

وحی کے یہ معانی لغت کے اعتبار سے تھے لیکن شریعت اسلام کی اصطلاح میں وحی خاص اس ذریعۂ غیبی کا نام ہے جس کے ذریعہ غور و فکر، کسب و نظر، اور تجربہ و استدلال کے بغیر خاص اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اُس کے فضل و لطفِ خاص سے کسی نبی کو کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔ وحی کا استعمال اس معنیٰ خاص میں اس کثرت سے ہوا ہے کہ اس معنی میں منقولِ شرعی بن گیا ہے اور اس لئے جب کسی نبی کے ذکر میں وحی کا لفظ بولا جائے گا تو اُس سے لامحالہ یہی معنی مراد ہوں گے۔ چنانچہ قرآن مجید کی آیات اسکی شاہد ہیں، اور جس کا ثبوت آیندہ باب سے مل جائے گا

اس کی مثال لفظ صلوٰۃ و زکوٰۃ اور حج کی سی ہے کہ اگرچہ ان کے لغوی معنیٰ اُن معانی مصطلحہ سے مختلف ہیں جن کے لئے اسلامی شریعت میں یہ مخصوص ہو چکے ہیں لیکن اصطلاحی معانی میں انکا استعمال اس کثرت سے ہوتا ہے کہ اب ان کے علاوہ کسی معنی میں یہانتک کہ لغوی معنیٰ میں بھی انکا استعمال صحیح نہیں ہے البتہ ہاں اگر سیاق یا سباق میں کوئی قرینہ ہو تو اُس وقت کوئی دوسرے معنی مراد لئے جا سکتے ہیں پس اسی طرح جب وحی کا لفظ مطلقاً بولا جائیگا تو اُس سے مُراد یہی اصطلاحی معنی خاص مراد ہونگے لیکن قرینہ کے

موجود ہونے کی صورت میں دوسرے معنیٰ بھی مراد لئے جا سکتے ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے۔

وحی اور الہام کا فرق | اس موقع پر وحی اور الہام کا فرق بھی معلوم کر لینا چاہئے۔ وحی کے معنیٰ اوپر معلوم ہو چکے۔ الہام کے لغوی معنی ہیں "القاء الشی فی القلب دل میں کسی چیز کا ڈالنا۔ قرآن مجید میں ہے۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا — اللہ نے نفس انسانی کو بُری باتوں اور نیک باتوں دونوں کا الہام کر دیا ہے۔

وحی اور الہام میں یہ امر تو مشترک ہے کہ دونوں کسی چیز کے معلوم کر لینے کا ذریعۂ غیبی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ الہام ایسا وجدان ہے جو نفس کو حاصل ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ شی مطلوب کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ علم کا مبدا کیا ہے، گویا یہ وجدان بھوک، پیاس، غم اور خوشی کے وجدان کی طرح ہے۔ بخلاف وحی کے کہ اُس میں علم کا مبدا پورے طور پر معلوم ہوتا ہے پھر ان میں ایک ما بہ الفرق یہ بھی ہے کہ الہام نبی اور غیر نبی دونوں کو ہوتا ہے لیکن وحی انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی غیر نبی کو علم کا یہ ذریعۂ غیبی میسّر نہیں ہو سکتا۔

وحی کی حقیقت | وحی کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس کا صحیح علم تو بجز خدا کے اور کسے ہو سکتا ہے۔ البتہ فلاسفہ نے اپنی بساط کے مطابق کچھ پتہ چلانے کی فکر کی ہے لیکن اس کا حاصل اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وحی کے امکان و جواز میں جو بہ ظاہر عقلی استبعاد نظر آتا ہے اُسے دور کریں اور یہ ثابت کر دیں کہ علم و اطلاع کے جس ذریعۂ غیبی کو وحی کہتے ہیں اُس کا تحقق انسان کے باطنی قوی اور ملکات کی دریافت و تحقیق کی روشنی میں ناممکن نہیں ہے۔ فلاسفۂ یونان کے تتبع میں متکلمینِ اسلام نے بھی اس روش کو اختیار کیا ہے اور انھوں نے بھی فلسفہ کی تحقیق اور اس کی اصطلاحات کی روشنی میں وحی کی حقیقت کا کھوج لگانے کی سعی کی ہے تاکہ وہ اُن اعتراضات و اشکالات کا جواب دے سکیں جو وحی ایسی مابعد الطبیعی چیزوں پر فلسفہ کی طرف سے کئے جاتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان ائمہ اسلام کی نیت نہایت مبارک اور پاک تھی، اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف

سے اُن کو اجرِ جزیل بھی عطا ہوگا۔ لیکن اس راہ سے اصل حقیقت کا سُراغ پانے میں کس حد تک کامیاب ہو سکے ہیں؟ اس کا جواب نہایت مشکل ہے۔ ہم ذیل میں محض اسی رفع استبعاد کے نقطۂ نظر سے، اور نیز یہ دکھانے کے لئے کہ وحی کی حقیقت کی تشریح و بیان کے سلسلہ میں فلسفہ کہاں تک پرواز کر سکا ہے۔

امام غزالی اور دوسرے متکلمین کی آراء | اس باب میں امام غزالی اور بعض فلاسفۂ اسلام کا بیان نقل کرتے ہیں

مقاصد المراصد میں ہے۔

واما الوحی والالھام فالنفس الناطقة	باقی وحی اور الہام تو اُن کی حقیقت یہ ہے کہ
اذا کانت قویۃ بحیث لم یکن	نفس ناطقہ جب اس قدر قوی ہوتا ہے کہ بدن
اشتغالھا بالبدن مانعا من الاتصال	کے ساتھ مشغول ہونے کے باوجود مبادی قدسیہ
بالمبادی القدسیۃ وکانت المتخیلۃ	سے متصل ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ قوتِ متخیلہ
قویۃ بحیث تقوی علی استخلاص	اس قدر قوی ہوتی ہے کہ حس مشترک کو حواس
الحس المشترک عن الحواس الظاھرۃ	ظاہری سے نجات دے سکتی ہے تو نفس ناطقہ
اتصلت حالۃ الیقظۃ بالعقول	بیداری کی حالت میں بھی عقول مجردہ اور نفوس
المجردۃ والنفوس السماویۃ وحصل	سماویہ سے متصل ہو جاتا ہے اور اس کو غیب
لھا ادراک المغیبات علی وجہ کلی	کی باتوں کا ادراک کلی طور پر ہوتا ہے اور پھر قوت
ثم المتخیلۃ تحاکیھا بصورۃ جزئیۃ	متخیلہ اس کے مشابہ ایک جزئی صورت پیدا کر لیتی
مناسبۃ لھا وتنزل الی الحس المشترک	ہے یہ صورت حس مشترک میں اُتر کر مشاہد اور محسوس
فتصیر مشاھدۃ محسوسۃ وقد یعرض	ہو جاتی ہے اور بعضوں کو یہ پیش آتا ہے کہ وہ
بعضھم ان یسمع کلاما منظوما او یشاھد	مسلسل کلام سنتے ہیں یا کوئی اچھی صورت دیکھتے
منظرا بھیا یخاطبہ بکلام منظوم فیما	ہیں جو اُن سے مسلسل الفاظ کے ذریعہ سے باتیں کرتی ہے

يَتَعلّقُ بِاَحْوالِہٖ واحوالِ مَا يَقرُبُ مِنْهُ	یہ باتیں خود انھیں کے متعلق ہوتی ہیں یا اُن کے تعلقات کے متعلق۔

اِس کے علاوہ معارج القدس میں نبوت کے زیرِ عنوان امام غزالی نے جو بسیط مضمون لکھا ہو اُس میں ایک فصل نبوّت کے خواص میں ہو اُس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

ولھا خواصٌ ثلثٌ احدھا تابعةٌ لقوة التخیل والعقل العملی	نبوت کے تین خاصّے ہیں، ایک خاصہ قوت تخیل اور عقل عملی کا تابع ہے۔

اس کے بعد اس خاصہ کو بہت شرح وبسط سے بیان کیا ہو جس کا حاصل وہی ہو جو مقاصد المراصد کی مندرجۂ بالا عبارت سے مستفاد ہوتا ہے۔

ابنِ سینا کی رائے | اس مضمون کو شیخ بوعلی سینا کے حوالہ سے ابوالبقا نے مختصر اور جامع ومانع الفاظ میں اِسی طرح ادا کیا ہو چنانچہ تعریفات میں جہاں وحی کی تعریف لکھی ہو لکھا ہے

فنحن نریٰ الاشیاء بواسطة الحسِ والنبی یریٰ الاشیاء بواسطہ القویٰ الباطنة ونحن نریٰ ثم نعلم والنبی یعلم ثم یریٰ	ہم حس کے واسطے سے اشیاء کو دیکھتے ہیں اور نبی اشیاء کو قویٰ باطنہ کے ذریعہ دیکھتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں پھر جانتے ہیں اور نبی جانتا ہے پھر دیکھتا ہے۔

اس کے علاوہ شیخ ابوعلی بن سینا نے اپنی متعدد کتابوں میں وحی، الہام اور معجزات وخوارق عادت پر کلام کیا ہو۔ اشارات کا ایک مستقل عنوان اسی بحث کے لئے وقف ہو۔ رسالہ الفعل والانفعال میں لکھا ہو۔

"وحی اور کرامات تاثیر النفسانی فی النفسانی میں داخل ہیں، کیونکہ وحی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کسی امر عقلی کا القاء خفی اُن نفوس بشریہ میں سے ہے جو اس القاء کو قبول کرنے کی استعداد رکھتے ہوں۔ اگر یہ القاء جاگنے کی حالت میں ہو تو اسے وحی کہتے ہیں۔ اور

اگر نیند کی حالت میں ہو تو اس کا نام نفث فی الروع ہے "

(مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن ص۳)

اس کے بعد نفث فی الروع کی چند مثالیں احادیث سے نقل کی ہیں۔

ابنِ سینا کی یہ وحی کی تعریف نہایت مجمل اور مغالطہ انگیز ہو۔ اپنے ایک اور رسالہ "الرسالۃ العرشیۃ" میں خدا کی صفات پر بحث کے ضمن میں صفتِ کلام پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہو۔

"خدا کی ساتویں صفت متکلم ہونا ہے۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ وہ ذات واحد ہے، اور علل اربعہ سے منزہ ہو۔ اس بنا پر اُس کے متکلم ہونے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اس کے لئے عبارتیں پائی جاتی ہیں، یا اُس کے لئے نفس کے خطرات اور فکر و تخیل کے ادراکات پائے جاتے ہیں جن پر الفاظ دلالت کرتے ہیں بلکہ خدا کے متکلم ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اُس کی طرف سے بواسطہ قلم نقاش جس کو عقل فعال یا مقرب فرشتہ کہتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لوح قلب پر علوم کا فیضان ہوتا ہو، پس کلام خدا اُن علوم کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص ہیں اور علم میں تعدد و تکثر نہیں ہوتا جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ — اور ہمارا کام تو بس ایک دم کی بات ہو۔ جیسے لپک نگاہ کی۔

تعدد اور تکثر تو حدیث نفس اور خیال وحس میں ہوتا ہو۔

اصل میں یہ صورت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ کے ذریعہ علم غیب کو حاصل کرتے تھے۔ اور قوت تخیل اس کو قبول کر کے مختلف حروف واشکال کی صورت سے مصور کر دیتی تھی، اس کے بعد نفس کی لوح جواب تک خالی ہوتی تھی اسمیں یہ عبارتیں اور صور میں منقش

ہوجاتی تھیں، اب ان سب کا اثر یہ ہوتا تھا کہ آپ منظوم و مرتب کلام سنتے تھے اور ایک انسانی جسم کو دیکھتے تھے۔ پس اسی کا نام وحی ہے، الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نفس مبارک ایک صاف و شفاف صیقل شدہ آئینہ کی طرح تھا جس میں القا کرنیوالے اور وہ معانی و مطالب جن کا القا کیا جاتا تھا۔ دونوں مصور ہو جاتے تھے کبھی ان معانی منقشہ کا ظہور عبرانی زبان میں ہوا اور کبھی عربی میں، گویا یوں کہیئے کہ مصدر ایک ہے اور مظاہر متعدد ہیں۔ اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نفس یا ذہن کے ذریعہ کس طرح ملائکہ کی رویت کر لیتے تھے، کیونکہ حس کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی محسوسات کو حواس ظاہری کیواسطے سے قبول کرتی ہے اور کبھی مشاعر باطنہ کیواسطہ سے، ہم میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں فرق یہ ہے کہ ہم پہلے دیکھتے ہیں پھر جانتے ہیں اور آنحضرت پہلے جانتے پھر دیکھتے تھے۔

(مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ص ۱۲)

حافظ ابن تیمیہ کی رائے لیکن اس معاملہ میں حافظ ابن تیمیہؒ نے مجموعۃ الفتاویٰ اور بعض تصنیفات میں زیادہ صاف بیانی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے ابن سینا اور اُس کے ہم خیال فلاسفہ کی تغلیط کی ہے اور ساتھ ہی امام غزالی پر نکتہ چینی کی ہے کہ وہ بھی فلسفہ سے مرعوب ہو کر وحی اور نبوت کے باب میں بعض ایسی باتیں بیان کر گئے ہیں جو قرآن و حدیث کی تصریحات کے خلاف ہیں، اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہ عقل فعّال کے وجود سے انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر عقل فعال کا وجود صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت وہبی نہیں کسبی ہے

بہرحال قرآن مجید سے وحی کے متعلق جو معلوم ہوتا ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ فرشتہ (جو فلاسفہ کے قول کے مطابق نفسِ انسانی کی صفات کا نام نہیں بلکہ وہ جواہر مجردہ اور قائمہ بالذات ہیں) خدا کا پیغام لیکر آنحضرت صلی اللہ پر نازل ہوتا تھا اور آپ کے قلب مطہر پر اس پیغام الٰہی کا القا کرتا تھا۔

وحی کی مختلف صورتیں

احادیث سے معلوم ہوتا ہے آپ پر وحی مختلف طریقوں سے نازل ہوتی تھی۔ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد جلد اوّل میں انھیں حدیثوں کے پیش نظر وحی کی حسب ذیل صورتیں بیان کی ہیں۔

۱۔ رویائے صادقہ — سچ خواب دیکھنا

۲۔ نفث فی الروع یا القاء فی القلب — دل میں پھونکنا یا دل میں ڈالنا

۳۔ صلصلۃ الجرس — گھنٹہ کی آواز کی طرح آنا

۴۔ تمثل — فرشتہ کا کسی شکل میں متشکل ہو کر نظر آنا

۵۔ فرشتہ کا اپنی اصلی صورت میں نظر آنا۔

۶۔ وہ طریقہ مکالمہ جو معراج میں پیش آیا

۷۔ بلا واسطہ مکالمہ

اب ہم ہر ایک کو تفصیل سے لکھتے ہیں۔

رویائے صادقہ رویائے صادقہ کے معنیٰ ہیں سچا خواب، یعنی جو کچھ رات کو خواب میں دیکھا فوراً ہی یا کچھ دنوں کے بعد بعینہٖ اس کے مطابق کوئی واقعہ ظاہر ہو گیا۔ اس خواب کو نبوّت کا چھیالیسواں جزء بتایا گیا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو سعید الخدری سے روایت ہے "الرؤیا الصالحۃ جزء من ستۃٍ واربعین جزءاً من النبوۃ"۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ رویاء صادقہ کو نبوۃ کا جز محض اس لئے فرمایا گیا ہے کہ جس طرح نبی کی خبر بالکل صحیح ہوتی ہے اور اس میں کذب و دروغ کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا

اسی طرح یہ خواب بالکل سچا ہوتا ہے جو رات کو خواب میں نظر آیا۔ دن کو وہی آنکھوں نے دیکھ لیا۔

یہی وجہ ہے کہ رویا، صادقہ کو نبوت کا جزء قرار دیا گیا ہے رسالت کا نہیں کیونکہ نبوت کے معنی بعض غیبی امور سے واقف ہونا اور ان کی اطلاع دینا ہے اور چونکہ رویا، صادقہ میں بھی یہی ہوتا ہے اس لئے اس کو نبوت کا ایک جزء کہا جا سکتا ہے لیکن رسالت کا مقام اس سے بلند ہے اس کے مفہوم میں احکام شرعیہ کی تبلیغ و اشاعت اور اوامر و نواہی سے لوگوں کو خبردار کرنا داخل ہے۔ ظاہر ہے رویا، صادقہ کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

یہی رویا، صادقہ ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ہوا۔ صحیح بخاری کے پہلے باب میں حضرت عائشہ سے روایت ہے۔

اوّل ما بدئ بہ رسول اللہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من الوحی الرویا الصالحۃ فی النوم فکان لا یریٰ رویا الّا جاءت مثل فلق الصبح	سب سے پہلی وہ چیز جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ہوا نیند میں رویا، صالحہ ہے حضور جو خواب دیکھتے تھے وہ صبح کے تڑکے کی طرح صحیح نکلتا تھا۔

لہ یہ واضح رہنا چاہئے کہ انبیاء کرام کا خواب ہمارے خواب اور اُن کی نیند ہماری نیند کی طرح نہیں ہوتی۔ اس عالم میں اُن کی آنکھیں اگرچہ بند ہوتی ہیں لیکن دل بیدار ہوتا ہے۔ بخاری میں ہے۔

تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم ان کی آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی نسبت فرماتے ہیں تنام عینی ولا ینام قلبی، اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہئے کہ عربی زبان میں رویا صرف اس خواب کو کہتے ہیں جو کسی حقیقت کے اخبار و اعلام یا اُس کی جانب اشارہ و ایماء پر مبنی ہو، عام خواب جس میں شیطانی وساوس کو زیادہ دخل ہو اُسے حلم جمع احلام کہتے ہیں۔

چنانچہ بخاری کتاب الرویا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے۔ (بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ پر)

| رویائے صادقہ سے آغاز وحی کی حکمت | حافظ ابن حجر عواب سے وحی کے آغاز کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ

عالم بیداری میں حضور پر نور پر جو وحی نازل ہونے والی تھی اس کے لئے بطور تمہید و توطیہ پہلی وحی خواب کے ذریعہ نازل کی گئی تاکہ آپ اس طرح خوارق عادات ایسی چیزوں کے لئے یک گونہ عادی ہو جائیں۔

| نفث فی الروع | دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتے آپ کے قلب پر بغیر نظر آئے کسی بات کا القاء کردیتا تھا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "روح القدس نے میرے قلب میں یہ بات ڈال دی کہ کوئی نفس اُس وقت تک نہیں مریگا جبتک کہ وہ اپنے رزق کی تکمیل نہیں کرلیگا پس تم اللہ سے ڈرو اور طلب میں خوش روشی سے کام لو اور خبردار رہو کہ کہیں رزق کا متاخر ہو جانا تم کو اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ اللہ کی معصیت کی راہ سے اس رزق کو طلب کرو کیونکہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی طاعت و بندگی سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

الرویا من اللہ والحلم من الشیطان — رویا اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور حلم شیطان کیطرف سے

پھر ان خوابوں میں جو خوابہائے پریشان ہوتے ہیں انھیں اضغاثِ احلام کہتے ہیں۔ سورۂ یوسف کی آیت ذیل میں تینوں لفظ جمع ہو گئے ہیں۔۔

يَآ أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِن كُنتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ ۝ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ

اے درباریو اگر تم خوابوں کی تعبیر بیان کر سکتے ہو تو میرے خواب کے بارے میں اپنی رائے بیان کرو۔ ان لوگوں نے کہا "یہ تو اوہام پریشان ہیں اور ہم ان اوہام وخیالات کی تعبیر سے واقف نہیں۔

لیکن حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیری رح کی تحقیق یہ ہے کہ رویا کے معنی خواب کے نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ایسی حالت کا نام ہے جو نہ پورے طور پر بیداری ہے اور نہ کامل نیند بلکہ ان دونوں کی ایک درمیانی حالت ہے۔ حضرت الاستاذ فرماتے ہیں کہ یہ میرا ذاتی خیال تھا لیکن مدت کے بعد علامہ فرید وجدی کی دائرۃ المعارف دیکھنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ میں جو کچھ رویا کی حقیقت

ہم سمجھتا تھا وہی بعینہٖ محققین یورپ کا خیال ہے۔ (فیض الباری مطبوعہ مصر ج ۱ صفحہ ۲۲)

صلصلۃ الجرس | تیسری صورت یہ تھی کہ وحی صلصلۃ الجرس یعنی گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی تھی صحیح بخاری میں ہے حارث بن ہشام نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا "کبھی کبھی وحی میرے پاس گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ میرے اوپر سخت ترین ہوتی ہے جب یہ مجھ سے منقطع ہوتی تھی تو فرشتہ جو کچھ کہتا تھا وہ سب مجھ کو یاد ہو جاتا تھا (باب بدء الوحی)

وحی کی اس خاص نوعیت کو سمجھنے کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ صلصلۃ اصل میں اس آواز کو کہتے ہیں جو لوہے کے ایک ٹکڑے کو دوسرے ٹکڑے پر مارنے سے پیدا ہوتی ہے لیکن پھر اس میں توسع کر لیا گیا ہے اور اس لفظ کا اطلاق ہر اُس آواز پر ہونے لگا ہے جس میں جھنجھناہٹ (طنین) ہو۔ وحی کی آواز کو اس آواز سے تشبیہ دی گئی ہے اور وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح گھنٹہ کی آواز صوتِ محض کی صورت میں سنائی دیتی ہے اور اُس کا کوئی مبداء و مقطع نہیں ہوتا۔ اسی طرح وحی یا پیغامبرِ وحی کی اس آواز میں بھی کوئی مبداء یا مقطع نہیں ہوتا تھا۔ اس بنا پر یہ آواز مرکب نہیں بلکہ بسیط ہوتی تھی۔ شیخ اکبر محی الدین بن عربی نے وجہ شبہ یہ بیان کی ہے کہ جس طرح گھنٹہ کی آواز کے لئے کوئی جہتِ خاص نہیں ہوتی بلکہ وہ تمام جوانب و جہات سے سُنائی دیتی ہے اسی طرح وحی کی اس آواز کے لئے بھی کوئی جانب یا جہت نہیں ہوتی تھی حضرت الاستاذ نے اس وجہ شبہ کو نہایت لطیف کہا ہے[1]، لیکن خود ایک جگہ فرماتے ہیں۔

وصلصلۃ الجرس ھھنا کنقرات	اور نزول وحی کے وقت گھنٹہ کی سی آواز ٹیلیگرام کی گھڑگھڑاہٹ
التلغراف لاداء الرسالۃ[2]	کی طرح ہے جو پیغام رسانی کے لئے کی جاتی ہے۔

اس تشبیہ سے اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ تار کی گھڑگھڑاہٹ میں آواز تو سنائی دیتی ہے لیکن بولنے والا نظر نہیں آتا۔ اسی طرح وحی کی اس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محض آواز سنتے تھے لیکن بولنے والا نظر نہ آتا تھا۔

---

[1] فیض الباری مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۱۹   [2] مشکلات القرآن ص ۱۲۴

اس حالت کی شدت | جیسا کہ صلصلۃ الجرس والی حدیث میں مذکور ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حالت بہت شاق گذرتی تھی حضرت عائشہ فرماتی ہیں "آپ پر وحی نازل ہوتی تھی اور دن نہایت سرد ہوتا تھا پھر بھی (وحی کے بار سے) آپ پر دباؤ اس قدر شدید ہوتا تھا کہ آپ کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلتا تھا، اور اگر آپ کسی سواری پر ہوتے تھے تو سواری بوجھ کے مارے زمین پر بیٹھ بیٹھ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طرح وحی آئی حضرت زید بن ثابت اُس وقت آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور سید کونین کا فرق مُبارک ان کی ران پر تھا حضرت زید پر وحی کا اتنا شدید بار ہوا کہ اُن کا جسم دبا جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پارہ پارہ ہو جائے گا۔

حضرت عبادۃ بن صامت کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ کو اضطراب پیدا ہو جاتا اور چہرہ مبارک کا رنگ بدل جاتا۔ آپ اس وقت سر جھکا لیتے اور جو صحابہ آپ کے پاس بیٹھے ہوتے تھے وہ بھی سر نیچا کر لیتے تھے، وحی کے بعد آپ سر اُٹھاتے تھے [۱]

صفوان بن یعلی بن اُمیہ بیان کرتے ہیں کہ یعلی کو بڑی خواہش تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی ہوئی دیکھیں، خدا نے اُن کی مراد پوری کی۔ ایک مرتبہ جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ میں قیام فرما تھے یعلی کو یہ سعادت نصیب ہو گئی اُس کی تفصیل یہ ہے کہ جعرانہ کے دوران قیام میں آں حضرت صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا جس نے خوشبو لگا رکھی تھی اور سوال کیا "اے رسول اللہ! آپ اس شخص کی نسبت کیا فرماتے ہیں جس نے ایک خوشبو لگے ہوئے جبہ میں ہی احرام کی نیت کر لی"، یہ سوال سنکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی دیر انتظار فرمایا، یہانتک کہ آپ پر یکایک وحی نازل ہوئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ حضور کا چہرۂ مُبارک سُرخ ہے اور سانس بھی تیز ہو گیا ہے جیسے کوئی تھکا ہوا ہو، تھوڑی دیر کے بعد جب یہ کیفیت دور ہو گئی تو آپ نے سائل کو بُلا کر

---

[۱] یہ واقعہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کیف نزل الوحی کے ماتحت ہی بیان کیا ہے۔

اُس کے سوال کا جواب دیا۔[1]

ایک سوال اور اس کا جواب اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ وحی وحی تو سب برابر ہے پھر اس کی وجہ کیا ہو کہ آپ پر وحی کی یہ قسم (صلصلۃ الجرس) بقیہ طرق وحی کی بہ نسبت زیادہ گراں گذرتی تھی؟ اگر ایک نوعِ وحی کا تحمل بآسانی ہو سکتا تھا تو اس نوعِ وحی کا تحمل کیوں دشوار تھا؟ اس کا جواب جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہو، یہ ہے کہ انسان میں دو قوتیں ہیں ایک قوتِ بشریت اور دوسری قوتِ ملکیت، پھر فرشتے جب اُن نفوسِ قدسیہ پر نازل ہوتے ہیں جن میں نبوت کی استعداد ہوتی ہو تو ان کو ظلمت بشری سے نکل کر عالم نور میں آنے کی وجہ سے سخت کش مکش اور مزاحمت باطنی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کش مکش کی وجہ سے ان کے تمام اعصاب متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال اس طرح سمجھئے کہ انسان نیند کی حالت میں کوئی ہیبت انگیز خواب دیکھتا ہے تو اگرچہ اُس خواب کا تعلق جسم سے نہیں ہوتا لیکن نفس کے تعلق بالجسم کے باعث اس خواب کا اثر جسمانی اعضاء و جوارح پر بھی ظاہر ہوتا ہو۔ حضرت شاہ صاحب نے صلصلۃ الجرس کی تشریح بھی اسی تاثر و انفعال کی روشنی میں کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

واما الصلصلة فحقيقتها ان الحواس	رہا صلصلۃ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ حواس سے
اذا صادمها تاثير قوی تشوشت فتشوش	جب کوئی قوی تاثیر متصادم ہوتی ہے تو وہ تشویش
قوة البصران يری الوانا الحمرة والصفرة	ہو جاتے ہیں چنانچہ قوتِ بصر کی تشویش یہ ہے کہ
والخضرة ونحو ذالك وتشويش قوة	مختلف رنگ مثلاً سرخی، زردی اور سبزی نظر
السمع ان يسمع اصواتا مبهمة كالطنين	آئیں وغیرہ ذالک، اور قوتِ سمع کی تشویش یہ
والصلصلة والهمهمة فاذا تم الاثر	ہے کہ مبہم آوازیں سُنائی دیں مثلاً طنین، صلصلۃ

[1] صحیح بخاری باب نزل القرآن بلسان قریش

حصل العلم — اور سمجھ، پھر جب اثر تمام ہوجاتا ہے علم حاصل ہوجاتا ہے

حجۃ اللہ البالغہ میں ہی ایک دوسرے مقام پر باب الایمان بصفات اللہ تعالیٰ کے ماتحت اسی مضمون کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

وربما یحصل عند توجھہ الی الغیب	اور بسا اوقات نبی کے غیب کی طرف متوجہ ہونے
وانبھار الحواس صوت صلصلۃ الجرس	اور حواس کے مغلوب ہونے کی صورت میں گھنٹہ
کما قد یکون عند عروض الغشی من	کے بجنے کی سی آواز آتی ہے جیسا کہ غشی کے عالم
رویۃ الوان حمر وسود[1]	میں سرخ اور سیاہ رنگ نظر آتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ یہ وہ خاص وقت ہوتا تھا جبکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم عالم مادیت سے وراء الوراء ہوکر ملاءِ اعلیٰ سے بہت زیادہ قریب ہوجاتے تھے اور اُس وقت اگرچہ آپ کے حواسِ ظاہری میں تشویش پیدا ہوجاتی تھی لیکن ساتھ ہی آپ کی تمام روحانی قوتیں باطنی احساس وشعور اور ملکوتی صفات وخصائص مکمل طور پر عالم لاہوت کے جلوہ زار میں پہنچ جاتے تھے اور وہاں آپ وہ سنتے تھے جسے دوسرے نہیں سُن سکتے اور ان حقائق سے علیٰ وجہ الیقین آشنا ہوتے تھے جنکو نہ مادی حواس محسوس کرسکتے ہیں اور نہ جسمانی آلاتِ ادراک وشعور انھیں دریافت کرسکتے ہیں اور چونکہ اس وقت آپ کی جہتِ بشری اور جہت ملکوتی میں تصادم ہوتا تھا اس لئے اُس کا اثر آپ کے اعضاء و اعصاب پر بھی پڑتا تھا اور اس اثر کے باعث آپ کو گھنٹہ کی سی آواز سنائی دیتی تھی جبینِ اقدس عرق آلود ہوجاتی تھی اور اس تاثر میں اس درجہ شدت ہوتی تھی کہ آپکے پاس جو صاحب بیٹھے ہوتے تھے انھیں بھی اس حالت کا بیّن طور پر احساس ہوتا تھا جب یہ کشمکش ختم ہوجاتی تو آپ کی یہ حالت یعنی اعصاب کا تاثر بھی زائل ہوجاتا تھا اور تمام وحی من وعن آپ کو یاد ہوجاتی تھی، چنانچہ حدیث کے الفاظ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۲۰۶ جدید اڈیشن۔

فیفصم عنی وقد وعیت عنه — وحی مجھ سے جب منقطع ہو جاتی تھی تو مجھ کو اسوقت سب کچھ یاد ہو جاتا تھا۔

میں اس امر کا ہی اظہار فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کو صلصلۃ الجرس کے لفظ سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ آپ محض آواز سنتے تھے اور وحی کا مضمون نہیں سمجھتے تھے۔ یا وحی کا مضمون اسوقت سمجھ لیتے تھے، لیکن وہ آپ کو محفوظ نہیں رہتا تھا۔ غور کیجیے بصیغہ ماضی وَعَیتُ فرمانا اُس مضمون کو زیادہ موکّد اور موثّق طریقہ پر بیان کرنے کے لئے ہی ہی۔

مزید تشریح | صلصلۃ الجرس کی مخصوص نوعِ وحی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مقام پیش آتا تھا اس کا تعلق محض روح اور نفس سے ہو اس لئے اس کی تشریح اگر کوئی کر سکتا ہے تو صرف وہی شخص کر سکتا ہو جو اپنی باطنی اور روحانی قوتوں کے باعث عقل اور نفس کے ملکات اور عالم تجرد کے ساتھ ان دونوں کے تعلقات سے آگاہ ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی سے بڑھ کر ان اسرار و رموز کا محرم کون ہوگا! آپ حجۃ اللہ البالغہ کی جلد دوم بحث فی المقامات والاحوال میں فرماتے ہیں۔

ان القلب لہٗ وجہان وجہ یمیلُ	قلب کے دو رُخ ہیں۔ ایک رخ بدن اور اعضاء کی
الی البدن والجوارح ووجہٌ یمیل	طرف مائل رہتا ہے اور دوسرا رخ تجرد اور صرافت
الی التجرد والصرافۃ وکذالک العقل	کی طرف متوجہ رہتا ہے اسی طرح عقل کے بھی دو رخ ہیں
لہ وجہان وجہٌ یمیل الی البدن	ایک رخ بدن اور حواس کی طرف مائل ہوتا ہی اور
والحواس ووجہ یمیل الی التجرد	دوسرا رخ تجرد اور بساطتِ محض کی جانب،
والصرافۃ فسمّوا مایلی الجانب السفلی	پس جو رُخ جانب اسفل سے متصل ہے اسے قلب
قلبًا وعقلًا وما یلی الجانب الفوق	اور عقل کہتے ہیں اور جو جانبِ فوق سے ملا ہوا ہی اسے
روحا وسرًا فصفۃ القلب الشوق	روح اور سر کہتے ہیں اور قلب کی صفت شوق

المزعج والوجد وصفه الس وح	بے پایاں اور وجد ہے، روح کی صفت مانوس و
الانس والانجذاب وصفۃ العقل	منجذب ہونا ہے اور عقل کی صفت ان چیزوں پر
الیقین بما یقرب ماخذہ من ماخذ	یقین کرنا ہے جن کا ماخذ علوم عادیہ (رسمیہ) سے
العلوم العادیۃ کالایمان	قریب ہو جیسے ایمان بالغیب اور توحید افعالی
بالغیب والتوحید الافعالی وصفۃ	اب رہا سِر تو اس کا کام ان حقائق کا مشاہدہ کرنا ہے
السر شہود ما یجل عن العلوم	جو علوم عادیہ سے بلند و بالا ہیں، اس کے معنی بجز
العادیۃ وانما ھو حکایۃٌ ما عن	اس کے کچھ اور نہیں کہ یہ اُس مجرد محض سے حکایت
المجرد الصرف الذی لیس فی	ہوتی ہے جو نہ زمان میں ہے اور نہ مکان میں اور
زمانٍ ولا مکانٍ ولا یوصف	جو نہ کسی وصف سے موصوف کیا جا سکتا ہے اور
بوصفٍ ولا یشار الیہ باشارۃ	نہ جس کی طرف کوئی اشارہ ہو سکتا ہے۔

غور کیجئے! حضرت شاہ صاحب نے کس خوبی اور وضاحت سے بتایا ہے کہ روح کی صفت اُنس اور انجذاب ہے اور سر کی صفت شہود و معائنہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ روح کی صفت انفعالی ہے اور سر کی صفت فعلی ہے۔ ان کیفیتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی سعادتمند روح پر جب آفتابِ حقیقت پرتو فگن ہوتا ہے تو اس کی شعاعیں شبنم کے قطروں کی طرح اس روح کو اپنے جلوہ گاہ انوار میں جذب کر لیتی ہیں، پھر عقل کا دوسرا رخ جو جانبِ فوق سے متصل ہے۔ یعنی سِر، وہ اُبھرتا ہے اور اب وہ اُس مجرد صرف سے حکایت کرنے لگتا ہے جو ولا عینٌ رأت ولا اذن سمعت کا مصداق ہے اور زمان و مکان کی حد بندیوں سے بلند و بالا ہے۔

اِس موقع پر یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ قلب اور عقل یہ دونوں جس طرح انبیاء میں ہوتے ہیں، اور انسانوں میں بھی ہوتے ہیں لیکن فرق یہ ہوتا ہے کہ انبیاء کرام میں قلب اور عقل کا وہ رخ جو روح اور سِر

کہلاتا ہے اس درجہ بلند اور قوی ہوتا ہو کہ کسی اور انسان میں یہ بات نہیں ہوتی۔ اس بنا پر انکو عالمِ فوق سے اتصال ہوتا ہو اور انھیں ایسے ایسے مقامات اور احوال و مزایا پیش آتے ہیں جو دوسروں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔ قرآن مجید میں حضور پر نور کی زبانِ حق ترجمان سے جو ارشاد فرمایا گیا ہو "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ" تو اس میں اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ اعضا و جوارح میں انسانوں کے ساتھ مشارکت کی بنا پر ہو اور پھر یوحیٰ الیّ جو فرمایا گیا ہو تو اس میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب و عقل کے دو فوقانی رخ جو حضرت شاہ ولی اللہ کی زبان میں روح اور سِر ہیں وہ اس درجہ بلند اور ارفع ہیں کہ آنحضرت مہبطِ وحی ہیں۔

مگر بات یہ ہو کہ انسان، انسان ہونے کے باوجود جس طرح ایک بزدل انتہائی بہادر انسان کے شجاعانہ کارناموں کو، ایک غبی پرلے درجہ کی ذکاوت و ذہانت رکھنے والے انسان کی دماغی بلند پروازیوں اور ذہنی کمالات کو نہیں سمجھ سکتا، اور جب اُن کا ذکر سنتا ہو تو حیرت و استعجاب سے انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتا ہو۔ اسی طرح "مجرد صرف" "ذاتِ حق" اور حقیقتِ مطلقہ سے قرب و اتصال کے باعث انبیا کرام پر جن اسرارِ الٰہیہ و کونیہ کا فیضان ہوتا ہے، ہم لوگ جب ان کا ذکر سنتے ہیں تو ہمیں حیرت ضرور ہوتی ہو اور بسا اوقات وہ امور ہمارے لئے ناقابلِ فہم ہوتے ہیں لیکن ہمیں یہ بات کبھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ ہمارے لئے کسی چیز کا ناقابلِ فہم ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ اُس کے وجود کا انکار ہی کر دیا جائے۔ مولانا شبلی مرحوم نے صحیح بخاری کی حدیث وحی پر کلام کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہو۔ "آپنے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کیا دیکھا؟ ناموس اعظم (حضرت جبریل) نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوئے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کرسکتیں" ایک مادر زاد اندھے کو روشنی کی حقیقت لاکھ کھولکر سمجھائیے کوئی بات اُسکے ذہن نشین نہیں ہوتی تو کیا محض اس بنا پر نابینا کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہو کہ وہ روشنی کے وجود کا ہی سرے سے انکار کر دے۔

یہ آواز کس کی تھی سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے بیان کی روشنی میں صلصلۃ الجرس کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں تھا حضرت شاہ صاحب نے نفس آواز سے بحث نہیں کی یعنی یہ نہیں بتایا کہ یہ آواز خدا کی تھی یا فرشتۂ وحی کی، یا خود وحی کی آواز تھی انھوں نے صرف اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ یہ آواز خواہ کسی کی ہو اس کو زبانِ نبوت نے گھنٹہ کی آواز سے کیوں تشبیہ دی ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مختصراً اس کا بھی ذکر کر دیا جائے کہ یہ آواز کس کی تھی؟ اس باب میں سب سے زیادہ نمایاں مسلک امام بخاری کا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ آواز خدا کی ہوتی تھی جو تمام فضا میں گونج جاتی تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور اُس کو نہیں سن سکتا تھا چنانچہ صحیح بخاری کتاب التوحید میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی یہ روایت نقل کرتے ہیں۔

اذا تکلم اللہ بالوحی سمع اھل السموٰت شیئاً فاذا فزع قلوبھم وسکن الصوت عرفوا انہ الحق ونادوا ماذا قال ربکم قالوا الحق	اللہ تعالیٰ جب کلام بالوحی کرتا ہے تو اہل سموٰت کچھ سنتے ہیں پھر جب ان کے قلوب سے خوف و ہراس کم ہو جاتا ہے اور آواز ٹھہر جاتی ہے تو وہ پہچانتے ہیں کہ یہی حق تھا اور وہ آپس میں ندا کرتے ہیں کہ تمھارے رب نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں کہ حق کہا!

اس سلسلہ میں امام بخاری نے ایک روایت بھی نقل کی ہے جو عبداللہ بن انیس سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں کو جمع کریگا اور ان کو ایسی ندا دیگا کہ قریب و بعید سب اُسے یکساں سنیں گے، پھر آگے چل کر ایک باب کا ترجمہ "وکلم اللہ موسیٰ تکلیماً" باندھا اور اس کے ذیل میں چند احادیث نقل کیں جن سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ چونکہ آیتِ بالا میں کلّم فعل کی تاکید مصدر تکلیم کے ساتھ لائی گئی ہے اس لئے علم نحو کے قواعد کے مطابق یہاں کلام سے مراد حقیقت ہے مجاز نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے وادیِ سینا میں جو آواز سنی تھی وہ سچ مچ خدا ہی کی آواز تھی

امام بخاری نے فرقہ جہمیہ کی تردید میں کتاب التوحید میں اور بھی احادیث پیش کی ہیں اور ان سے خدا کے لیئے صوت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اس بنا پر صلصلۃ الجرس والی حدیث میں جس آواز کا ذکر ہے وہ امام بخاری کے نزدیک خدا کی ہی آواز ہو۔

ارباب تصوف وعرفان میں شیخ اکبر کا جو مقام ہو اہل علم سے پوشیدہ نہیں، وہ بھی خدا کے لیئے صوت مانتے ہیں۔ چنانچہ وحی پر کلام کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ اللہ کی آواز کے لیے کوئی جہت اور سمت متعین نہیں کیجا سکتی اور چونکہ گھنٹہ کی آواز کا حال بھی یہی ہو کہ وہ ہر طرف سے سُنی جاتی ہے اس بنا پر ہی صوت بالوحی کو گھنٹہ کی آواز سے تشبیہ دی گئی ہے، لیکن علمار کی اکثریت جسمیں صحیح بخاری کے شارحین بھی داخل ہیں اس بات کی قائل ہو کہ یہ آواز فرشتۂ وحی کے پروں کی۔ یا فرشتہ کی زبانی وحی کی ہوتی تھی۔ حافظ ابن حجران میں سے پہلی شق کے قائل ہیں۔ واللہ اعلم۔

تمثل یعنی فرشتہ کا کسی انسانی شکل میں آنا

وحی کا چوتھا طریقہ یہ تھا کہ فرشتۂ وحی کسی انسان کی شکل وصورت میں آتا تھا اور وہ آپ سے خطاب کرتا تھا یہاں تک آپ کو وہ پوری بات یاد ہو جاتی تھی جو وہ آپسے کہتا تھا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت عمرؓ سے روایت ہو کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آیا جس کے کپڑے بہت زیادہ سفید اور بال بہت سیاہ تھے اس پر کوئی علامت سفر بھی نہیں تھی اور ہم میں سے کوئی ایک شخص بھی اُسے نہیں جانتا تھا۔ یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اس طرح بیٹھ گیا کہ اپنے گھٹنے حضور کے گھٹنوں پر ٹیک لئے اور اپنے دونوں ہاتھ آپ کی رانوں پر رکھ دیئے پھر اسلام۔ ایمان، احسان، قیامت اور علاماتِ قیامت سے متعلق آپسے چند سوالات کئے۔ آپ ان سوالات کے جوابات دیتے جاتے تھے اور سائل ہر جواب پر "صدقت" (آپنے سچ فرمایا) کہتا جاتا تھا، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں ہمیں بڑا تعجب ہوتا تھا کہ یہ شخص سوال کرتا ہے اور جواب ملنے پر تصدیق بھی کرتا جاتا ہو گویا کہ اُسے ان سوالات کے جوابات کا علم پہلے سے ہی تھا۔ سوال و

جواب کے ختم ہونے پر یہ شخص واپس چلا گیا تو آنحضرت نے حضرت عمرؓ سے دریافت فرمایا "تم جانتے ہو کہ یہ کون شخص تھا؟" انھوں نے جواب دیا "اللہ اور اس کا رسول اعلم ہیں" آپ نے فرمایا "یہ جبریل تھے جو تم کو دین سکھانے آئے تھے"

صحابہ میں حضرت وحیہؓ خوبصورتی اور حسن و جمال کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ اس لئے فرشتۂ وحی کبھی کبھی ان کی شکل میں بھی آتا تھا۔ صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے کہ ایک مرتبہ جبریل امین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور باتیں کرنے لگے۔ اس وقت آنحضرت کے پاس اُم سلمہ بیٹھی ہوئی تھیں آپ نے اُن سے پوچھا "یہ کون ہیں" وہ بولیں "یہ تو وحیہ ہیں" ام سلمہ کا بیان ہے کہ بخدا میں انکو وحیہ ہی سمجھتی رہی یہاں تک کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سُنا جس میں آپ نے جبریل امین کے آنے کی خبر دی۔ تب میں سمجھی کہ جبریل وحیہ کی شکل میں آئے تھے [1]

اسی طرح کا ایک واقعہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے ساتھ پیش آیا، ایک مرتبہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ایک شخص سے گفتگو کر رہے ہیں جو سواری پر سوار ہے جب گھر واپس آئے تو ام المومنین نے پوچھا "یہ کون شخص تھا جس سے آپ گفتگو کر رہے تھے؟ ارشاد ہوا "یہ جبریل تھے انھوں نے مجھ کو حکم کیا ہے کہ میں بنو قریظہ کی طرف چلا جاؤں [2]۔

فرشتہ کا اپنی اصلی شکل میں آنا | وحی کا پانچواں طریقہ یہ تھا کہ فرشتہ اپنی اصلی شکل میں آتا تھا اور اللہ کا پیغام آپ تک پہنچاتا تھا۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل کو ان کی اصلی شکل میں دو مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ واقعۂ معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اور ایک دفعہ کسی اور مقام پر غالباً اجیاد میں بعض علماء کی رائے ہے کہ قرآن مجید میں سورۂ النجم کی مندرجہ ذیل آیات انھیں

---

[1] باب کیف نزل الوحی

[2] یہ واقعہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کیف نزل الوحی کے ماتحت نقل کیا ہے۔

دو واقعوں سے متعلق ہیں معراج کے علاوہ آنحضرتؐ نے جو جبریلِ امین کو ان کو انکی اصلی شکل میں دیکھا تھا اس کا ذکر ان آیات میں ہے۔

عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ	انکو بڑی طاقتوں والے اور مضبوط نے تعلیم دی پھر وہ
وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ	سیدھا ہو گیا اور وہ بہت اوپر آسمان کے کنارہ
فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ	پر تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور لٹک گیا۔ اب فاصلہ
فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ مَا كَذَبَ	دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم تھا اور اب خدا
الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ	نے اپنے بندہ پر وحی کی۔ جو کی۔ دل نے جو کچھ دیکھا
مَا يَرَىٰ	اُسے جھوٹ نہیں کہا۔ کیا تم لوگ پیغمبروں سے اُن
	چیزوں پر جھگڑتے ہو جو اُنھوں نے دیکھی ہیں۔

ان آیات میں جبریلِ امین کی جو صفات بیان کی گئیں ہیں سورۂ تکویر میں بھی اُن میں سے بعض کا ذکر ہے ارشاد ہے

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ	یہ کہا ہوا ہے ایک کریم قاصد کا جو طاقتور ہے۔ اور جو
عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ مُّطَاعٍ	عرش کے مالک خدا کے نزدیک مرتبہ والا ہے اس کی
ثَمَّ أَمِينٍ وَمَا صَاحِبُكُم بِمَجْنُونٍ	اطاعت کی جاتی ہے اور وہ وہاں امانت دار ہے
وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ	اور تمھارے ساتھی (آنحضرت) مجنون نہیں ہیں۔
	انھوں نے فرشتہ کو اُفق مبین پر دیکھا ہے

سورۂ النجم اور سورۂ تکویر کی ان آیتوں پر غور کیجیے، ان میں یہ بات مشترک ہے کہ جبریلِ امین کی صفت ذی قوۃ اور امین بیان کی گئی ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ آنحضرت نے ان کو اُفقِ اعلیٰ پر دیکھا ہے اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ اس مرتبہ فرشتۂ وحی کا نزول کسی غیر معمولی اور عظیم و

جلیل شکل میں ہوا اور دوسری یہ کہ فرشتہ نے خود اپنی زبان سے وحی کا تلفظ کیا تھا، اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے، پھر دونوں صورتوں میں فرشتہ کے ورود و نزول کے بیان کے بعد اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا اور سنا وہ سرتاسر حق تھا اور آپ کا دل ایک ایک بات کی تصدیق کر رہا تھا اسے کوئی اشتباہ نہیں تھا۔

دوسرا واقعہ حضرت جبریلؑ کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کا جو معراج میں پیش آیا اس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى	اور آنحضرت نے دوسری مرتبہ بھی اُترتے ہوئے
عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا	جبریل کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا ہے جس کے
جَنَّةُ الْمَاْوٰى اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ	پاس جنۃ الماویٰ ہے، اسوقت سدرہ پر عجیب و
مَا يَغْشٰى مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى	غریب انوار چھائے ہوئے تھے (مگر) نہ نگاہ بہکی
	اور نہ اُس نے سرکشی کی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، علماء کے ایک گروہ کا خیال یہی ہے کہ سورۃ النجم کی آیاتِ بالا دونوں واقعوں سے متعلق ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے اس کی تصدیق و تائید بھی ہوتی ہے لیکن اس مقام پر ایک شبہ یہ ہو کہ فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ میں اگر اوحیٰ کی ضمیر مرفوعِ مستتر کو جبریلؑ کیطرف لوٹایا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وحی کے کرنے والے جبریل امین ہیں حالانکہ اسی سورۃ کے شروع میں عَلَّمَهٗ شدید القوی، فرما کر ان کی حیثیت موحی کی نہیں بلکہ معلّم کی بتائی گئی ہو اور قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی ایحاء کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہو مثلاً ایک مقام پر ہو "وان اهتديت فبما يوحى الى ربى" ایک جگہ ہو "ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ" ایک سورۃ میں ہے "وَالَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ"

ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے "ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ اِلَيْكَ" اگر کہیں یُوحیٰ بہ صیغۂ مجہول لایا بھی گیا ہے تو وہاں بھی "مِن رَّبِّي" فرما کر اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ایحار اللہ تعالیٰ کا ہی فعل ہے جیسے اس آیت میں :۔ "قُلْ اِنَّمَا اَتَّبِعُ مَا يُوحٰى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّي" ہاں! اس میں شک نہیں کہ بعض آیات میں ایحاء کی نسبت خود جبریل امین کیطرف بھی کی گئی ہے لیکن ایسے واقع پر ان کی حیثیتِ رسول بھی متعین کر دی گئی ہے اور ساتھ ہی خدا کا ذکر ہے جیسے اس آیت او يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَاءُ اس سے مقصد یہ ہے کہ جہاں التباس و اشتباہ کا خدشہ نہ ہو جبریل ؑ کی طرف ایحاء کی نسبت کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

یہ اور اس طرح کے بعض اور اشکالات کے باعث سورۃ النجم کی یہ آیات بھی مشکلات قرآن میں شمار کی گئی ہیں جن پر افسوس ہے کہ مفسرین اور علماء سیرت نے کچھ زیادہ توجہ نہیں کی اور جو کلام کیا ہے وہ محض سطحی اور سرسری ہے۔ اس موقع پر ہم ذیل میں مختصراً وہ تقریر نقل کرتے ہیں جو حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ الکشمیری رح نے "مشکلات القرآن" میں کی ہے اور جسے مولانا شبیر احمد العثمانی رح نے فتح الملہم کی جلد اول میں صفحہ ۳۳۵-۳۳۶ پر نقل کیا ہے۔ حضرت الاستاذ فرماتے ہیں :۔

علامہ کشمیری کی تقریر

اس سورۃ میں نجم (ستارہ) کی قسم اس لیئے کھائی گئی ہے کہ اس کے بعد جو کلام ہے وہ آسمان کی خبر اور معراج وغیرہ سے متعلق ہے۔ ان آیتوں کا خلاصہ اور لُبِّ لباب یہی چیزیں ہیں اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى میں فعل بہ صیغۂ مجہول لایا گیا اور مُوحِی کی کوئی تعیین نہیں کی گئی، کیونکہ ایحا بجز اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے لئے ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ وصف خدا میں منحصر ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جو اوصاف موصوف کی ذات میں منحصر ہوں اُن کا ذکر خود موصوف کے تسمیہ سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے مثلاً مَرَرْتُ بِاَكْرَمِ الْقَوْمِ" اس کے بعد فرمایا گیا "عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى" اس میں موحی کے ذکر کے بعد مُعَلِّم کی طرف

انتقال ہے۔ کیونکہ یہاں دو گرامی شخصیتوں کا ذکر ہے، ایک اللہ تعالیٰ جو موحی ہے اور دوسرا معلم جو جبرئیل ہیں۔ اس کے بعد معلم کے اوصاف بتائے گئے کیونکہ کلام اہلِ مکہ کے ساتھ ہے اور یہ لوگ جبریلؑ کی معرفت نہیں رکھتے تھے اس لئے جبریلؑ کا فعل اور اُن کی صفات بیان کی گئی اور یہی وہ اوصاف ہیں جو سورۂ تکویر میں بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ان آیات کا مقصد گویا یہ بتانا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کس طرح آتی تھی؟ اور اسکی صفت کیا تھی؟

حضرت الاستاذ نے اسکے بعد حافظ ابن قیم کی تفسیر کی روشنی میں ذومرّۃٍ فاستویٰ کے مطلب کی تشریح کی ہے جس کا یہاں ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ پھر فتدلّٰی کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:۔

جیسا کہ قاضی بیضاوی نے ذکر کیا ہے اس میں اس بات کیطرف اشارہ ہے کہ ہر حالت میں جبریلؑ اپنے مکان سے متجاوز نہیں ہوتے تھے کیونکہ تدلّٰی کے معنیٰ ہیں استرسال مع التعلق جیسے پھل کے لٹک آنے کو تدلّٰی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جبریلؑ امین کی تدلی کی مثال اُس روشنی کی مانند ہے جو فضا میں پھیلی ہوئی ہو اور کسی روشندان میں سے ہوکر بھی گذر رہی ہو، اس کو دیکھنے والا اپنے گھر میں دیکھتا ہے مگر پھر بھی وہ جانتا ہے کہ روشنی اپنے موضع سے منفصل نہیں ہے۔ تدلّی کے لفظ سے جب یہ معنیٰ مراد لئے جائیں تو اس سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ حضرت جبریلؑ کس طرح بصورت بشر آتے تھے۔ اسکے بعد فرمایا گیا "فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ" اس میں ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے۔ جبریلؑ کی طرف نہیں، امام طبری کے نزدیک اس کے معنیٰ یہ ہیں "فاوحیٰ اللہ الیٰ ما اوحی" یہی معنیٰ امام مسلم کے نزدیک مراد ہیں۔ اور امام بخاری نے شریک بن ابی نمر سے جو روایت نقل کی ہے اس سے بھی یہی معنیٰ مستفاد ہوتے ہیں امام احمد (مسند صفحہ ۱۴۹/۳) نے ثابت عن انس کے طریق

سے جو روایت کی ہے اس سے بھی اسی معنیٰ کی تائید ہوتی ہے۔ ان سب روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت "فَاَوْحیٰ اِلیٰ عَبْدِہٖ مَآ اَوْحیٰ" واقعۂ معراج (لیلۃ الاسریٰ) سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں اُن روایات کی مراجعت کرنی چاہیے جو ابن کثیر (صـ ۳۲۵/۵) میں بہ طریق بن ابی الکہتلہ اور مسند احمد ۱/۴۰۲ میں امام احمد سے منقول ہیں۔

پوچھا جاسکتا ہے کہ اس صورت میں جبکہ "اوحیٰ الی عبدہٖ ما اوحیٰ" میں اوحیٰ کا فاعل جبریل کے بجائے خدا کو بنایا جائے۔ انتشارِ ضمائر اور انفکاک فی النظم لازم آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شبہ بے بنیاد اور نا درست ہے کیونکہ ایجار کا وصف اللہ تعالےٰ میں منحصر ہے اور سورۂ النجم کی ان آیات میں دو کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک موحی اور دوسرا معلم اس بنا پر اوحیٰ کی ضمیر مرفوعِ مستتر خدا کی طرف ہی راجع ہونی چاہیے انتشار ضمائر معنیٰ میں التباس و اشتباہ کا سبب ہوتا ہے اس بنا پر وہ ناجائز ہے لیکن یہاں معنیٰ میں اشتباہ کا امکان ہی نہیں۔

علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی ہے کہ ان آیتوں میں عطف واو کے ذریعہ سے نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ ایک مرتب سلسلہ ہے جسمیں بعض چیزیں بعض چیزوں پر خارج میں مرتب ہوتی چلی گئی ہیں اور ان سب کی انتہا اللہ پر ہوتی ہے اس اعتبار سے "فاوحی الی عبدہٖ ما اوحیٰ" اس مضمون کے لئے بہ طور خلاصہ ہے جو "اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحیٰ" میں بیان کیا گیا ہے۔ اب پھر اسی مضمون کو بیان کیا جا رہا ہے جیساکہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں کیا گیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا "مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی" اس کو ما قبل سے منفصل لایا گیا اور عطف نہیں کیا گیا۔ کیونکہ یہ دل سے اللہ کی رویت اور جبریل امین کی اُنکی اصلی شکل میں

رویت کے مضمون پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں روایتیں معراج سے پہلے کی ہیں پھر مَارَاٰی
میں اللہ اور جبریل کی رویت کے علاوہ وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو آپ نے
شب معراج میں دیکھیں۔ چنانچہ آگے چل کر فرمایا گیا ہے۔

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی — آنحضرتؐ نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں

سورۂ بنی اسرائیل میں ذکر ہے۔

لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا — تاکہ ہم آپ کو اپنی آیات دکھائیں۔

پھر اسی مقام پر ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْ اَرَیْنٰكَ — اور جو رویا ہم نے آپ کو دکھایا ہے ہم نے
اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ — اس کو لوگوں کیلئے آزمائش کی چیز بنایا ہے

اس آیت میں جو فتنہ ہے یہ وہی ممارات (جھگڑنا) ہے جس پر " اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی
مَا یَرٰی فرما کر ممارات کرنے والوں کو زجر و توبیخ کی گئی ہے۔

اس تقریر سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی کی تقدیر عبارت
یوں ہے مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ عَبْدَنَا مَا رَاٰی اس رائ کا فاعل عبد یعنی آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم ہیں اور یہ رویت عام ہے خواہ دل کے ذریعہ سے ہو یا آنکھ کے ذریعہ۔ اس صورت میں کذب
متعدی بدو مفعول ہوگا اور اس میں کوئی دشواری نہیں کیونکہ تکذیب کی طرح کذب بھی متعدی
بدو مفعول ہو کر آتا ہے مثلاً یوں کہیں صَدَقْتُ فلاناً الحدیث و کذبتہٗ اور یہ بھی ہوسکتا
ہے کہ اس کو ایک مفعول پر ہی مقتصر مانا جائے۔ جیسا کہ امام نووی نے فراء سے نقل کیا ہے
اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ دل نے اس معاملہ میں جھوٹ نہیں کہا بلکہ اس نے وہی کہا
جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں عیاناً دیکھا۔

آگے چلئے ارشاد ہوتا ہے " وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی " اس میں اگر رَاٰی کا فاعل آنحضرتؐ کو نہیں بلکہ فواد کو بنایا جائے تو یہ زیادہ واضح بات ہوگی اور اب اس صورت میں معنیٰ یہ ہوں گے کہ قلب نے جو کچھ دیکھا تھا اس کو مِن وعَن بیان کر دیا اور اس میں جھوٹ نہیں کہا۔ یہاں رویت سے مراد رویتِ فواد ہوگی اور بعد میں جو رویت بصر کا ذکر ہے تو واضح رہنا چاہیئے کہ ان دونوں میں کوئی تصادم اور تعارض نہیں ہے کیونکہ رویت امر واحد ہے خواہ دل سے ہو یا آنکھ سے فرق صرف فاعل کا ہے اس لئے عبارت میں انفکاک اور نظم میں انتشار پیدا نہیں ہوتا۔

مرفوع احادیث اور صحیح آثار سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی رویت دو مرتبہ ہوئی ہے ایک مرتبہ دل سے اور دوسری مرتبہ آنکھ سے مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی کے بعد جو اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی " ہے اس میں بجائے صیغہ ماضی کے یرٰی بصیغہ مضارع فرمانا بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ رویتِ اولیٰ کے علاوہ کوئی اور رویت ہے۔ حضرت ابنِ عباس کا ایک اثر ہے اس سے بھی اس کی ہی تائید ہوتی ہے آپ فرماتے ہیں " محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ آنکھ سے اور دوسری مرتبہ دل سے " علامہ طبرانی نے اس اثر کو اوسط میں نقل کیا ہے اور سوائے جہور بن منصور الکوفی کے اسکے تمام راوی صحیح کے رُواۃ ہیں، جہور بن منصور کو بھی ابنِ حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے اس کے بعد فرماتے ہیں " وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی " میں جو رویت ہے وہ خدا اور جبریل دونوں سے متعلق ہے۔ جبریل امین کی رویت تو ظاہر ہے۔ اللہ کی رویت ماننے کی صورت میں یہ کہنا پڑیگا کہ جس طرح بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ خدا رات کے ثلث آخر میں سماءِ دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں بھی نَزْلَةً اُخْرٰی کے معنی نزولِ الٰہی کے ہو سکتے ہیں اب رہا " عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی " تو یہ واضح رہنا چاہیئے کہ ظرف یعنی عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی مرئی کے ساتھ متعلق نہیں بلکہ رویت کیساتھ ہے جیسے کہتے ہیں " رَاَیْتُ الْهِلَالَ عِنْدَ الْمَسْجِدِ " اس تقریر کی بنا پر

عِندَ سدرۃ المنتھیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو متعین کرتا ہو نہ کہ جبریل یا خدا کے مقام کو۔

حضرت الاستاذ کی یہ تقریر نہایت مفصل ہے[۵] اور آپ نے اس میں عجیب وغریب نکات و لطائف مستند حوالوں کی روشنی میں بیان کئے ہیں۔ ہم نے مذکورۂ بالا انتخاب میں جستہ جستہ وہی فقرے نقل کئے ہیں جو ہمارے موضوع بحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تقریر سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سورۂ النجم کی آیاتِ مبحوث عنہا صرف واقعہ معراج سے متعلق ہیں اور ان میں لیلۃ الاسرٰی کے ہی احوال وکیفیات کو نہایت بلیغ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ وحی اس واقعہ کی ابتدائی منزل ہے اس لئے شروع میں وحی کی صفت اور اس کی کیفیت وامکان پر روشنی ڈالی گئی ہے

آیات النجم کی مذکورۂ بالا تفسیر کے مطابق حضرت جبریلؑ کی ان کی اصلی شکل میں رویت ایک تو وہ ہے جو معراج میں ہوئی۔ اب رہی دوسری رویت جس کا ذکر حضرت عائشہؓ نے کیا ہے تو اس کی نسبت مختلف روایتیں ہیں حضرت عائشہ کی ہی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسری رویت کا واقعہ ایک مقام پر جس کا نام اجیاد ہے پیش آیا تھا۔ بعض روایتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غارِ حرا میں آپ پر جب پہلی وحی "اقرأ باسم ربک" نازل ہوئی تو اس دفعہ جبریل اپنی اصلی شکل میں ہی تشریف لائے تھے ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے اور بخاری کی احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ہم ذیل میں پوری حدیث نقل کرتے ہیں تاکہ اس خاص مسئلہ کے علاوہ وحی کی بعض اور کیفیات پر بھی روشنی پڑ جائے۔

"حضرت عائشہ ام المومنین سے روایت ہے کہ سب سے پہلی وحی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ خواب میں بہ صورت رویائے صالحہ تھی' آنحضرتؐ جو خواب دیکھتے تھے وہ صبح کے روشن اجالے کی طرح سچ نکلتا تھا۔ پھر آپ کو تنہائی محبوب ہو گئی' غارِ حرا میں جا کر آپ تنہا کچھ دن بسر کرتے تھے اور گھر آنے سے پہلے کئی کئی شب عبادت میں مصروف رہتے تھے' کھانے پینے کی چیزیں بھی ساتھ

---

[۵] پوری تقریر کے لئے دیکھو مشکلات القرآن مطبوعۂ علمی ڈابھیل از صفحہ ۲۴۰ تا ۲۶۲

لے جاتے تھے جب وہ سامان ختم ہو جاتا تو گھر واپس آتے اور پھر نیا سامان لے کر غار میں تشریف لے جاتے۔ یہاں تک کہ غار میں ہی حق آپ کے سامنے آیا اور وہ فرشتہ آپ کے پاس پہونچا اور اس نے کہا "پڑھ" آپ نے فرمایا "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" حضور فرماتے ہیں "اب اس فرشتہ نے مجھ کو پکڑ کر اتنا دبایا کہ میں تھک گیا۔ پھر اس نے مجھ کو چھوڑ دیا اور کہا "پڑھ" میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" اب اس فرشتہ نے مجھ کو پکڑ لیا اور پھر دبایا یہاں تک کہ میں تھک گیا۔ پھر اس نے مجھ کو چھوڑ دیا اور کہا "پڑھ" میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" فرشتہ نے تیسری مرتبہ پھر مجھ کو پکڑا۔ دبایا اور چھوڑ دیا اور کہا۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ،	پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا
خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ	کیا ہے جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا
وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ	کیا ہے پڑھ اور تیرا پروردگار بڑا بزرگ ہے جس نے
عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ	قلم کے ذریعہ سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا ہے
يَعْلَمْ	جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیتوں کے ساتھ گھر واپس آئے۔ قلب مبارک لرز رہا تھا۔ حضرت خدیجہ بنت خویلد کے پاس آئے اور فرمایا "مجھ کو کمبل اڑھا دو" مجھ کو کمبل اڑھا دو" لوگوں نے آپ کو کمبل اڑھا دیا یہاں تک کہ دہشت کی وہ حالت جاتی رہی۔ پھر آپ نے حضرت خدیجہ سے سارا ماجرا بیان کیا اور فرمایا کہ مجھ کو اپنی جان کا خطرہ ہے۔ حضرت خدیجہ بولیں ہرگز نہیں خدا آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا آپ قرابت داروں سے صلہ رحمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ لوگوں کا بوجھ خود اٹھاتے ہیں۔ اپاہجوں اور محتاجوں کے لئے کمائی کرتے ہیں۔ مہمانوں کی مہمانداری کرتے ہیں مصائب و حوادث میں آپ حق کی امداد و اعانت کرتے ہیں" پھر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لیکر ورقہ بن نوفل کے پاس آئیں

جو حضرت خدیجہ کے چچازاد بھائی تھے اور جنھوں نے عہد جاہلیت میں عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ یہ انجیل کو عبرانی میں لکھتے تھے جتنا بھی لکھ سکتے تھے، بڈھے بہت تھے۔ بصارت جاتی رہی تھی۔ حضرت خدیجہ نے ان سے کہا "بھائی ذرا اپنے بھتیجے کی سنو" ورقہ بولے "بھتیجے! ابا! تم کیا دیکھتے ہو؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا کہہ سنایا۔ ورقہ بولے "یہ وہی ناموس (محرم اسرار) ہے جسکو اللہ نے موسیٰ پر نازل کیا تھا۔ اے کاش میں اس وقت جوان ہوتا اے کاش میں اس وقت زندہ ہوتا، جب کہ تمہاری قوم تم کو نکال دیگی" آنحضرت نے پوچھا "کیا میری قوم مجھ کو نکال دیگی؟" انھوں نے جواب دیا "ہاں جو چیز تم لے کر آئے ہو وہ ایسی چیز ہے کہ جو کوئی اس کو لے کر آیا اس کے ساتھ دشمنی کی گئی اور اگر میں اس روز تک زندہ رہا تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ نہایت قوی اور مضبوط مدد۔ اس واقعہ کو پیش آئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا[۱]۔

اس واقعہ میں اگرچہ اس کا ذکر نہیں ہے کہ فرشتۂ وحی اصلی شکل میں نازل ہوا تھا یا کسی انسانی صورت میں آیا تھا لیکن حضور کا جبریل کو فرشتہ کہنا، ان کی آمد سے خوف زدہ ہو جانا اور جبریل کے دبانے سے آپ کا تعب زدہ ہو جانا یہ سب اس امر کے قرائن ہیں کہ فرشتۂ وحی کا نزول اپنی اصلی شکل میں ہوا تھا، ساتھ ہی اس پر غور کرو کہ حضور کا اس واقعہ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہونا اور پھر ورقہ کا تسلی و تشفی کرنا کس طرح صاف صاف بتا رہا ہے کہ حضور کو جو وحی الٰہی پہونچی آپ پہلے سے اس سے باخبر نہیں تھے اور یہ جو کچھ ہوا محض خدا کے حکم سے اور آپ کے اپنے ارادہ کے بغیر ہوا۔ کیا سیدِ کونین کے پیغمبر ہونے اور آپ کے پیغام کے وحی الٰہی ہونے کی کوئی نفسیاتی دلیل اس سے بڑھ کر ہو سکتی ہے؟

[۱] اس واقعہ میں ورقہ بن نوفل نے جو کچھ کہا ہے اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی ہے اس کے پیش نظر تمام علماء اسلام کا اتفاق ہے کہ وہ مومن تھے یہاں تک کہ بعضوں نے تو ان کو صحابہ میں بھی شمار کیا ہے البتہ اس میں تردد ہے کہ آیا وہ اس امت میں بھی شمار ہو سکتے ہیں یا نہیں وجہ یہ ہے کہ دعوتِ اسلام کے ظہور سے پہلے انکی وفات ہو گئی تھی

چھٹا طریقہ وحی | ایک طریقۂ وحی یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی فرشتہ یا آواز کے توسط کے براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر وحی نازل فرماتے جیسا کہ لیلۃ المعراج میں پانچ نمازوں کو فرض کیا گیا۔

ساتواں طریقہ وحی | ایک طریقہ وحی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی فرشتہ کی وساطت کے بغیر کلام کرے جیسا کہ از روئے نصِ قرآن حضرت موسیٰ کے لیے ثابت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی معراج میں ثابت ہے۔

حافظ ابن قیم وحی کے یہ سات طریقے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ بعض علماء نے ان طریقوں پر ایک اور طریقہ کا اضافہ کیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ پس پردۂ وحجاب نہیں بلکہ تمام حجابوں کو اٹھا کر نظروں کے سامنے جلوہ نما ہو اور شرفِ خطاب وکلام عطا فرمائے علامہ فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ وحی ان لوگوں کے نزدیک تو متحقق ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ سیدِ اولادِ آدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک دیدارِ الٰہی سے شادکام وفائز المرام ہوئی تھی، لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ مسئلہ علماء سلف وخلف میں مختلف فیہ رہا ہے (روایتیں دونوں قسم کی ہیں) اگرچہ اس بارہ میں جمہور صحابہ بلکہ سب کے سب ہی حضرت عائشہ کے ساتھ ہیں۔ کما حکاہ عثمان بن سعید الدارمی[۱]

آنحضرت اور مسئلۂ رویت باری کی تحقیق | سورۂ النجم میں جو آیات وحی سے متعلق ہیں چونکہ ان میں رویتِ باری کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر اس مسئلہ کو کسی قدر تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔ جیسا کہ علامہ ابن قیم نے فرمایا ہے یہ مسئلہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں باری تعالیٰ کی رویتِ بصری ہوئی تھی یا نہیں. علماء سلف وخلف میں مختلف رہا ہے اور وجہ اختلاف یہ ہے کہ آثار وروایات، مثبت ومنفی دونوں طرح کی ہیں یہ صحیح ہے کہ حضرت عائشہ کا مسلک اس باب میں یہی تھا

[۱] زاد المعاد ج ا ص ۲۵

کہ وہ رویت کی نفی کرتی تھیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت مسروق سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ ام المومنین نے فرمایا" ابو عائشہ تین باتیں ایسی ہیں جن میں سے اگر کسی ایک کا بھی کوئی شخص قائل ہوا تو اس نے خدا پر بڑا بہتان باندھا" میں نے پوچھا" وہ کیا باتیں ہیں ارشاد ہوا جس شخص نے یہ کہا کہ محمدؐ نے خدا کو دیکھا اس نے خدا پر بڑی تہمت لگائی" مسروق کہتے ہیں" میں تکیہ لگائے بیٹھا تھا یہ سن کر اٹھ بیٹھا اور عرض کیا" اے ام المومنین آپ ذرا مجھ کو مہلت دیجیے اور جلدی نہ کیجیے کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ	اور آپ نے اس کو افق مبین پر دیکھا اور
وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی	آپ نے اس کو دوبارہ اترتے ہوئے دیکھا

حضرت عائشہ نے جواب دیا" سب سے پہلے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت سوال کیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں جن کو میں نے ان دو مرتبوں کے علاوہ ان کی اصلی شکل میں کبھی نہیں دیکھا، میں نے ان کو آسمان سے اترتے ہوئے اس طرح دیکھا کہ انھوں نے زمین و آسمان کے درمیان کی تمام فضا کو گھیر لیا تھا" اس کے بعد ام المومنین نے فرمایا" کیا تم نے نہیں سنا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ	نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو
الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ	پالیتا ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے۔

کیا تم نے نہیں سنا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ	کسی بشر کی مجال نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے
اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ	کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ یا پس پردہ یا اس
اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا	طرح کہ وہ رسول کو بھیجے۔

اس کے برخلاف بعض روایتوں سے اس سوال کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس سے شریک بن عبداللہ نے جو روایت کی ہے اس کے آخر میں ہے۔

حَتّٰى جَاءَ سِدْرَةَ الْمُنْتَهٰى وَدَنَا	یہاں تک کہ آپ سدۃ المنتہیٰ تک پہونچے
الْجَبَّارُ رَبُّ الْعِزَّةِ فَتَدَلّٰى	تو عزت والا جبار خدا قریب آیا یہاں تک
حَتّٰى كَانَ مِنْهُ قَابَ قَوْسَيْنِ	آپ کے اور خدا کے درمیان دو کمانوں یا
اَوْ اَدْنٰى (کتاب التوحید)	اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا۔

صحابہ میں جو حضرات رویت کا ثبوت مانتے تھے ان میں حضرت عبداللہ بن عباس کو خاص امتیاز ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے حضرت عکرمہ کی موجودگی میں فرمایا" رَاٰی مُحَمَّدٌ رَبَّہٗ " محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔ عکرمہ بولے کہ اللہ کا ارشاد نہیں ہے" لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ " فرمایا" ہاں سچ ہے لیکن اس وقت جب کہ خدا اپنے اصلی نور میں جلوہ فروز ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دو مرتبہ دیکھا ہے" (ترمذی باب التفسیر سورۃ النجم) ترمذی میں ابوسلمہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے آیت" وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى " کی تلاوت کرنے کے بعد فرمایا" وَقَدْ رَاٰهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "

صحیح مسلم و ترمذی میں حضرت ابوذر غفاری سے روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا" یا رسول اللہ آپ نے خدا کو بھی دیکھا ہے؟" فرمایا" وہ تو نور ہے میں اسے کہاں دیکھ سکتا ہوں" اس روایت سے بہ بظاہر رویت کی نفی کا مضمون ظاہر ہوتا ہے لیکن حضرت عبداللہ بن عباس کے الفاظ میں اس کا جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ آپ کا یہ فرمانا کہ میں اس کو کہاں دیکھ سکتا ہوں" اس وقت کے لئے مخصوص ہے جب کہ خدا اپنے اصلی نور میں جلوہ فروز ہو۔ چنانچہ صحیح مسلم (ج ۱ باب الاسراء) اور ترمذی (تفسیر سورۃ النجم) میں ایک روایت ہے جس میں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں نے صرف ایک نور دیکھا تھا۔ گویا حضرت عائشہ رضؓ جس آیت سے رویت باری کے عدم امکان پر استدلال کرتی ہیں یعنی لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ تو حضرت ابن عباس اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ کے معنی یہ ہیں کہ نگاہیں حضرت باری عز اسمہٗ کا احاطہ نہیں کر سکتی اور وہ اس ذاتِ بے ہمتا و بے مثال کو اس طرح نہیں دیکھتیں جس طرح کہ وہ کسی متمکن چیز کو دیکھ لیتی ہیں اس بنا پر حضور پر نور کا نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ فرمانا بھی اسی مراد پر محمول کرنا چاہیئے۔

پھر وہ حضرات جو ثبوتِ رویت کے قائل ہیں، ان کا ایک استدلال یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کی نص

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ — اس دن چہرے تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے۔

اور دوسری آیات و احادیث کے مطابق اہل سنت والجماعت کے نزدیک اتنا تو مسلّم ہے ہی کہ آخرت میں اہلِ جنت کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ پس جب آخرت میں عام اہلِ جنت دیدار الٰہی کی نعمت و دولت سے شرف اندوز ہو سکتے ہیں تو اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں یہ امتیاز حاصل ہو گیا ہو تو اس میں استبعاد کی کیا بات ہے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس نزاع کو دور کرنے کی ایک صورت یہ تجویز کی ہے کہ حضرت ابن عباس سے اس معاملہ میں جو روایات منقول ہیں وہ دو طرح کی ہیں ایک مطلق اور دوسری مقید۔ مطلق تو وہ ہی روایات ہیں جو اوپر گذر چکیں اور جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مطلق دیدار الٰہی کا خواہ چشم ظاہر کے ذریعہ ہو یا چشم قلب سے ذکر ہے ان روایات کے ساتھ ہی بعض روایات ہیں جن میں مطلق نہیں بلکہ مقید رویت کا ذکر ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ابو العالیہ کی سند سے مذکور ہے کہ حضرت ابن عباس نے مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى کی تفسیر میں فرمایا۔

رَاٰی رَبَّہٗ بفوادہٖ مَرَّتَین — آنحضرت نے اپنے رب کو چشم قلب سے دو مرتبہ دیکھا

حضرت عطا کی سند سے ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔

رَاٰہُ بِقَلْبِہٖ — آنحضرت نے خدا کو اپنے قلب کی آنکھ سے دیکھا تھا

ابن مردویہ نے اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ بہ طریق عطا نقل کیا ہے۔

لَمْ یَرَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وَسَلَّمَ بِعَیْنِہٖ اِنَّمَا رَاٰہُ بِقَلْبِہٖ[۵] — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو آنکھ سے نہیں دیکھا، بلکہ دل سے دیکھا تھا۔

پس حضرت ابن عباس کی جن روایتوں میں مطلق رویت کا ذکر ہے اور چشم یا قلب کسی کی تصریح نہیں ہے۔ اگر مقید روایات کے پیش نظر اُن کو بھی رویت بالفواد پر محمول کر لیا جائے اور ساتھ ہی حضرت عائشہ کی روایات میں جو رویت کی نفی ہے۔ اس کو رویت بالعین پر محمول کر لیا جائے تو اب کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ ثبوت رویت جس اعتبار سے ہے اس اعتبار سے نفی رویت نہیں اور حضرت عائشہ جس رویت کی نفی کرتی ہیں یعنی رویت بالبصر حضرت ابن عباس اس کے قائل نہیں۔

ظاہر ہے کہ جہاں تک روایات و آثار کا تعلق ہے۔ حافظ ابن حجر کی اس تقریر سے حضرت ابن عباس اور ام المومنین حضرت عائشہ کے اس نزاع کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ قرآن مجید سے تو رویت بصری کا پتہ چلتا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی — قوت بینائی میں نہ تو کجی پیدا ہوئی اور نہ اس نے سرکشی کی۔

ہماری رائے میں اس موقعہ پر حضرت الاستاذ مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری نے جو تقریر کی ہے وہ اس مشکل کا بہترین حل ہے ہم اسے مختصراً ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

---

[۵] فتح الباری جدید اڈیشن ج ۸ ص ۴۹۳

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یقیناً رویت ہوئی تھی۔ لیکن بات یہ ہے کہ رویت ایک طرح کی ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کی مختلف نوعتیں ہوتی ہیں نوعیتوں کے اس اختلاف کی وجہ سے ایک طرح کی رویت کا ثبوت دوسری نوع کی رویت کی نفی ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک دوست اپنے دوست کو دیکھتا ہے۔ ایک خادم اپنے مخدوم کو دیکھتا ہے۔ ایک ادنیٰ درجہ کا آدمی ایک جلیل القدر بادشاہ کی دید کرتا ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ ان سب مثالوں میں ایک رویت دوسری رویت سے بالکل مختلف طریقہ پہ پائی جا رہی ہے۔ پس اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت باری عزاسمہٗ کی جو دید ہوئی تھی وہ ایک خاص طرح کی دید تھی جس کو ہم دنیا کی کسی دید پر بھی قیاس نہیں کر سکتے۔ اس بنا پر ہمارا دید کا اثبات اور نفی دونوں صحیح ہوں گے۔ اثبات ایک خاص دید کے لحاظ سے ہے اور نفی دنیوی دید کے اعتبار سے۔ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ اثبات و نفی رویت میں منافی اور تضاد نہیں ہے بلکہ دونوں مراد کی ایک ایک طرف کو ظاہر کرتے ہیں۔"

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رویتِ باری کو اگر تمثیلاً بیان کیا جا سکتا ہے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی چشمِ اشتیاق و تمنا نے ذاتِ احدیت کے جمالِ بے مثال کا نظارہ اس طرح کیا کہ جس طرح ایک عاشق اپنے محبوب کا یا ایک باادب نوکر اپنے آقا کا کرتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں دیکھنے والا اپنی نگاہ کو روک بھی نہیں سکتا اور ساتھ ہی اس کی مجال یہ بھی نہیں ہوتی کہ وہ آنکھیں جما کر مشاہدہ کرے قرآن مجید میں اس رویت کے سلسلہ میں جو مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی فرمایا گیا ہے۔ تو اس میں رویت کی اس خاص کیفیت و نوعیت کی ہی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ "مَا زَاغَ" کا مطلب یہ ہے کہ چشمِ محمدی نے جمالِ الٰہی کے دیکھنے میں تغافل و تسامح کو بالکل روا نہیں رکھا۔ پھر "مَا طَغٰی" سے مراد یہ ہے کہ باوجود کمالِ

اشتیاق کے چشمِ محمدی کیلئے یہ ناممکن تھا کہ وہ دائرۂ ادب سے باہر قدم رکھے۔ یعنی اپنی نگاہیں جمالِ ربّانی پر جمادے۔ کسی عربی شاعر نے کہا ہے۔

اَشتاقہٗ فَاِذَا بدَا اَطرَقتُ مِن اِجلَالِہٖ

ترجمہ:- میں اس کا مشتاق دید ہوں، لیکن جب وہ ظاہر ہوتا ہے تو میں اس کی جلالتِ شان کی وجہ سے سرنگون ہو جاتا ہوں۔

قرآن اور وحی

چونکہ تمام اعتقادات اور ایمان و عمل کا دار و مدار اس یقین پر ہے کہ پیغمبر کی زبانِ حق ترجمان سے جو کچھ ادا ہو رہا ہے وہ منجانب اللہ ہے اور جن احکام کے اتباع کا حکم دیا جا رہا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے ہی ارشاد فرمائے ہوئے ہیں اس لئے ہر آسمانی مذہب کا فرض ہے کہ وہ اپنے احکام کی تعلیم و تلقین سے پہلے لوگوں کو اپنے آسمانی ہونے کا یقین دلائے اور اسلام چونکہ دنیا کا آخری اور سب سے زیادہ کامل و مکمل مذہب ہے اور اس کی دعوت کسی خاص ملک و قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے۔ اس بنا پر تمام سماوی ادیان و مذاہب میں یہ امتیازِ خصوصی صرف قرآنِ مجید کو حاصل ہے کہ جس تکرار و تاکید سے اس نے اپنا مُنزّل من اللہ ہونا بیان کیا ہے کسی اور کتاب نے اپنی نسبت اس شد و مد اور تاکید و تکرار سے نہیں بیان کیا

قرآن کے منزّل من اللہ ہونے پر تحدی

جو لوگ اس کے مُنزّل من اللہ ہونے پر شک کرتے ہیں ان کو تحدیؔ کی گئی۔ ارشاد ہے۔

وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی	اور اگر تم کو کچھ شبہ ہو اس چیز کے متعلق جو ہم
عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ	نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس جیسی
وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ	کوئی سورۃ لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے
اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ـ	گواہوں کو بلا لو اگر تم سچے ہو۔

پھر اس پر ہی بس نہیں بلکہ سخت تہدید کے انداز میں فرمایا جاتا ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ (بقرہ)

اور اگر تم ایسا نہ کر و (یعنی قرآن کی کسی سورت کا مثل نہ لاؤ) اور تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

ایک مقام پر ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا (بنی اسرائیل)

(اے نبی) آپ کہہ دیجئے کہ اگر انسان اور جن اس قرآن کا مثل لانے پر متفق ہو جائیں تب بھی وہ اس کا مثل نہیں لا سکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں۔

ایک جگہ قرآن مجید کو منزل من اللہ نہ ماننے والوں کو جو اسے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام کہتے تھے اس طرح تحدی کی گئی ہے۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (یونس)

کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے (نبی نے) خود اسے گھڑ لیا ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اچھا اگر ایسا ہے تو تم اس جیسی ایک سورۃ تو لے آؤ اور اللہ کے سوا جن کو تم بلا سکتے ہو بلا لو اگر تم سچے ہو۔

یہ لوگ جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے ان کی نسبت فرمایا گیا کہ یہ محض اپنی کوتاہ علمی اور ناواقفیت کے باعث ایسا کہتے ہیں اور اس امر کی نسبت جھوٹ بولتے ہیں جسے یہ خود نہیں جانتے۔ آیت بالا کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے۔

بَلْ کَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا

بلکہ انھوں نے ایسی چیز کی تکذیب کی ہے جس کے

يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ (یونس)

علم کا احاطہ انھوں نے نہیں کیا اور جس کی اصل حقیقت ان کے سامنے نہیں آئی اسی طرح ان لوگوں سے پہلے بھی لوگوں نے تکذیب کی ہے پس آپ دیکھئے کہ ظالموں کا انجام کیا ہوا۔

ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ فَإِن لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ (ھود)

کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے خود قرآن گھڑ لیا ہے آپ کہہ دیجئے کہ اچھا اس طرح کی دس گھڑی ہوئی سورتیں ہی لے آؤ اور اللہ کے سوا جن لوگوں کو تم بلا سکو بلا لو اگر تم سچے ہو اور اگر وہ کچھ جواب نہ دیں تو جان لو کہ وہ اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے اور یہ کہ سوائے خدا کے کوئی دوسرا معبود نہیں ہے تو کیا تم اطاعت قبول کرنے والے ہو۔

اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منکرین کی ہوا پرستی کا اس طرح یقین دلایا جاتا ہے۔

فَإِن لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (القصص)

(اے محمد) اگر وہ لوگ آپ کو جواب نہ دیں تو آپ جان لیں کہ یہ لوگ صرف اپنی خواہشوں کا اتباع کرتے ہیں اور ان لوگوں سے زیادہ گمراہ کون ہے جو اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہوں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

بعض جزی واقعات سے قرآن مجید کے وحی ہونے پر استدلال

یہ آیات جو اوپر گزریں ان میں قرآنی اعجاز کو پیش کرکے سخت ترین تحدی کی گئی ہے اور منکرین کے عجز سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی وحی ہے۔ ان آیات کے علاوہ بکثرت دوسری آیتیں بھی ہیں جن میں قرآن مجید کے وحی ہونے پر بعض جزی واقعات اور قرآن مجید کے مضامین ومطالب سے استدلال کیا گیا ہے مثلاً

أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ بَل لَّا يُؤْمِنُونَ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ (الطور)

یا یہ کہتے ہیں کہ (پیغمبر) قرآن مجید خود بنالائے ہیں (کوئی نہیں)، بلکہ یہ لوگ ایمان نہیں لائے ہیں۔ اب ان کو چاہیے کہ کوئی بات اسی طرح کی لے آئیں اگر وہ سچے ہیں۔

حضرت یوسف کا واقعہ بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ (یوسف)

یہ غیب کی خبریں جو ہم آپ پر وحی کرتے ہیں اور آپ (اے محمد) ان کے پاس نہیں تھے جب انھوں نے اپنی کوشش مرکوز کرلی اور وہ تدبیریں کرنے لگے۔

حضرت مریم کے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے۔

ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ (مریم)

یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کے پاس وحی کرتے ہیں اور آپ ان لوگوں کے پاس نہیں تھے جب وہ قرعہ اس غرض سے ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کریگا اور آپ ان کے پاس نہیں تھے جبکہ وہ جھگڑ رہے تھے

اس آیت کو ذرا غور سے پڑھیئے اور دیکھئے کہ اس میں دو مرتبہ "وَمَا کُنْتَ لَدَیْھِمْ" فرما کر اس بات پر زور ڈالا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود حضرت مریم کی کفالت پر بحث و تکرار کے وقت موجود نہیں تھے تو اب قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آپ کو اس واقعہ کا علم کس طرح ہوا؟ قرآن مجید اس کا جواب دیتا ہے کہ "نُوْحِیْہِ اِلَیْکَ" ہم آپ پر اس کی وحی بھیجتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ کسی گذشتہ واقعہ کو معلوم کرنے کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اُس کو کسی اخبار یا کتاب میں پڑھا ہو اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی سے سننے کا اتفاق ہوا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان دونوں میں سے کوئی ایک صورت بھی متحقق نہیں تھی پہلی صورت کی تو آپ نے خود "لَسْتُ بِقَارِئٍ" میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" فرما کر نفی کردی اور آپ کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس کی تردید نہیں کرسکا۔ اب رہی دوسری صورت، یعنی یہ کہ آپ کو کسی نے یہ واقعات غیب سنائے ہوں تو قرآن مجید اس کی تردید اس طرح کرتا ہے حضرت نوح کے قصہ کے بعد ارشاد ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْھَآ	یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ
اِلَیْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُھَآ اَنْتَ	پر وحی کرتے ہیں اس لئے پہلے نہ آپ اس کو
وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ ھٰذَا	جانتے تھے اور نہ آپکی قوم، آپ صبر کیجئے کوئی
فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِیْنَ (ہود)	شبہ نہیں کہ عاقبت پرہیزگاروں کیلئے ہی ہے

پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ان دونوں میں سے کوئی ایک ذریعۂ علم بھی نہیں ہے تو اب قرآن کا دعویٰ "نوحیہ الیک" کے تسلیم کرنے میں کیا تذبذب ہوسکتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ اِذْ قَضَیْنَآ	اور اے نبی آپ طور کی جانب غربی میں نہیں
اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ	تھے جب ہم نے موسیٰ کیطرف اپنا فیصلہ نازل

الشّٰهِدِيْنَ (القصص) کیا اور آپ اس وقت وہاں موجود نہ تھے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا۔

وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ (القصص)

لیکن ہم نے بہت سی جماعتیں پیدا کیں اور ان پر دراز مدتیں گذر گئیں اور آپ مدین والوں میں نہ رہتے تھے کہ ان کو ہماری آیات سناتے لیکن ہم رسول بھیجتے رہے ہیں

اس آیت کے بعد جو آیت ہے اس میں بھی اس مضمون کا اعادہ کیا گیا ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (القصص)

اور آپ طور کے کسی کنارہ پر نہیں تھے جب ہم نے ندا دی لیکن آپ کو یہ واقعہ محض اپنے رب کی رحمت سے معلوم ہوا ہے تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جس کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں

عرب کی گذشتہ قوموں کے حالات سنانے کے بعد ارشادِ حق بنیاد ہے۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا

یہ آبادیاں وہ ہیں جن کے کچھ حالات ہم آپکو سناتے ہیں۔

سورہ عنکبوت کی آیت ذیل میں اسی مضمون کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس انسانی ذرائع علم میں سے کوئی ذریعہ نہیں تھا اور آپ کا ذریعہ علم صرف وحی الٰہی تھا اور زیادہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ

نزول قرآن سے پہلے نہ تو آپ کوئی کتاب

وَلَا تَخُطُّہٗ بِیَمِیْنِکَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ

پڑھتے تھے اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو ان باطل پرستوں کے لیے شبہ کی گنجائش بھی نکلتی۔

اس آیت میں صراحۃً اس بات کا اعلان کر دیا گیا ہے کہ آپ نزولِ قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔

ایک مقام پر ارشاد ہے۔

وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ (شعراء)

اور اس طرح ہم نے آپ کے پاس اپنے حکم سے روح بھیجی۔ آپ جانتے ہی نہیں تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔

اب ایک احتمال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ غیبی اطلاعات آپ نے کسی سے سنی ہوں تو اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مکہ معظمہ میں دو قسم کے لوگ آباد تھے ایک مشرکین اور دوسرے اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ مشرکین چونکہ کوئی کتاب نہیں رکھتے تھے اس لئے ان کو انبیاء متقدمین کا کوئی واقعہ بھی معلوم نہیں تھا، چنانچہ حضرت مریم کے قصہ میں "مَا کُنْتَ تَعْلَمُھَا اَنْتَ وَلَا قَوْمُکَ" فرما کر اسی امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اب رہے مکہ کے اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ تو اس میں شبہ نہیں کہ ان لوگوں کی آسمانی کتابوں میں بعض انبیاء کے واقعات کا تذکرہ ضرور ہے لیکن سید کونینؐ کے بڑے سے بڑے دشمن بھی جانتے تھے کہ آپ نبوت سے پہلے ان لوگوں سے الگ تھلگ رہتے تھے اور اس لئے کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں کر سکتا تھا کہ آپ کو ان غیبی قصص و واقعات کا علم یہود و نصاریٰ کے ذریعہ ہوا ہے۔ دشمنوں نے آپ کی تکذیب میں کیا کچھ کہا لیکن قرآن کے ادعاء "نَقُصُّ عَلَیْکَ" یا "نُوْحِیْہِ اِلَیْکَ"

کے جواب میں یہ کہنے کی جسارت کسی ایک کو بھی نہیں ہوئی کہ آپ فلاں وقت یا فلاں مقام پر کسی عیسائی یا یہودی سے قصہ سُن رہے تھے۔ لے دے کے عیسائیوں کے پاس بحیرا راہب کا ایک افسانہ ہے جو اول تو ثابت نہیں اور اگر ثابت مان بھی لیا جائے تو کیا دنیا کا کوئی معمولی عقل کا انسان بھی اسے باور کر سکتا ہے کہ راہب نے چند منٹوں میں ہی آپ کو جب کہ آپ کی عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اور آپ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ شام کے سفر پر جا رہے تھے وہ سب کچھ بتا دیا جو قرآن مجید کے دو دفتون کے درمیان ہے اور پھر آپ نے اس کو بغیر لکھے ہی من وعن گوشۂ خاطر میں محفوظ کر لیا اور لطف یہ ہے کہ آپ شام سے واپس آتے ہیں اور اس کے بعد (نبوت سے قبل تک) ستائیس اٹھائیس سال مکہ میں رہتے ہیں اپنے قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں اور اس کے باوجود راہب کے سنائے ہوئے واقعات کو چہل سالگی کی عمر تک بالکل حرفِ راز کی طرح سینہ میں پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اشارۃً وکنایۃً بھی کسی سے کسی واقعہ کا ذکر نہیں آتا اور چالیس سال کی عمر کے بعد یکایک غیبی اطلاعات کا سمندر امنڈ پڑتا ہے۔ یا للعجب

بہر حال یہ احتمال چونکہ اس درجہ کمزور تھا کہ آپ کے دشمنوں کے حاشیۂ خیال میں بھی موجود نہیں تھا اس لئے قرآن مجید نے اس سے سکوت کیا۔

عدم اختلاف سے قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر استدلال

جزئی واقعات کے علاوہ قرآن مجید میں اختلاف کے نہ ہونے سے بھی اس کے منزل من اللہ ہونے پر استدلال کیا ہے۔ ارشاد ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط وَلَوْ	کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے اور اگر
کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا	یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ
فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (نساء)	اس میں کثیر اختلاف پاتے۔

اہل کتاب قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے باخبر ہیں

اہل کتاب اگرچہ زبان سے انکار کرتے تھے لیکن دل میں وہ بھی جانتے تھے کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خود اہل کتاب تھے اور اس بنا پر کلام الٰہی اور وحی ربانی کے مفہوم سے یکسر بیگانہ نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کی تسکین کے لئے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (بقرہ)

اور وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوا ہے پس آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔

ایک دوسری آیت میں ہے۔

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ (سبا)

اور وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے وہی حق ہے۔

ایک اہل کتاب کی شہادت کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی۔

لیکن چونکہ اس زمانہ میں عرب کے جاہل مشرکین بنو اسرائیل کے علم وفضل سے مرعوب تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کی تردید وتکذیب کیلئے ان علماء کا سہارا ڈھونڈھتے تھے جس میں ان کو ہمیشہ ناکامی اس بنا پر ہوتی تھی کہ خدا نے خود ان علماء کی زبان سے آنحضرت کی رسالت اور قرآن کے وحی ہونے کی تصدیق کرا دی تھی بلکہ ان میں بعض علماء تو ایسے تھے جنھوں نے سرکار دوعالم کا روئے انور دیکھتے ہی سر اطاعت

وتسلیم خم کردیا اور بے ساختہ بول اٹھے "اِنَّ ھٰذَا الوجہ لیس بوجہ کاذب" بے شبہ یہ چہرہ کوئی کاذب چہرہ نہیں ہے" اس لئے ان منکرین وحی کو عار دلانے اور قرآن مجید کے وحی الٰہی ہونے کی حقیقت کو ان پر بطور الزام ثابت کرنے کے لئے ایک عالم بنی اسرائیل (عبداللہ بن سلام) کی شہادت کو بھی اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

قُلْ اَرَاَیْتُمْ اِنْ کَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ وَکَفَرْتُمْ بِہٖ وَشَھِدَ شَاھِدٌ مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ عَلٰی مِثْلِہٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَکْبَرْتُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (الاحقاف)

آپ فرمایئے بھلا دیکھو تو اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے آیا ہو اور تم نے اس کو نہیں مانا اور بنو اسرائیل کا ایک گواہ اس کی گواہی بھی دے چکا اور وہ ایمان لے آیا مگر، تم نے غرور کیا۔ بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

سورۂ بنی اسرائیل میں اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قُلْ اٰمِنُوْا بِہٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ط اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِہٖٓ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْھِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا وَّیَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ کَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا

آپ کہئے تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ جن لوگوں کو قرآن سے پہلے علم ملا ہے ان پر جب اس قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارا رب اس کا وعدہ ہو کر رہا۔[۱]

---

[۱] اس آیت کا مفاد بھی یہ جتانا ہے کہ قرآن کی حقانیت اور آنحضرت صلعم کی نبوت کی تصدیق وہ انصاف پسند ارباب علم کر رہے ہیں جنھیں پچھلی کتابوں کی بشارت سے واقفیت ہے" وعداللہ" سے اشارہ اس وعدہ ربانی کی طرف ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی زبانی توراۃ کتاب استثناء میں اسطرح کیا گیا تھا اے بنی اسرائیل میں تمہارے بھائیوں (بنی اسمٰعیل) میں سے ایک نبی اٹھاؤں گا جسکے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا" علماء اہل کتاب قرآن مجید کو سن کر فوراً سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور وہ یقین کرتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہی رسول مبشر بہا ہیں اور قرآن وہی کلام خداوندی ہے جس کا ذکر توراۃ میں کیا گیا ہے ؛

ایک آیت میں مشرکین سے پوچھا گیا ہے کہ کیا علماء بنی اسرائیل کا قرآن کی حقیقت سے آگاہ ہونا تمہارے لئے خدا کی کوئی نشانی نہیں ہے؟

أَوَلَمْ يَكُن لَّهُمْ آيَةً أَن يَعْلَمَهُ عُلَمَاءُ بَنِي إِسْرَائِيلَ (الشعراء)

کیا ان کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں۔

مشرکین وحی سے بیگانہ تھے لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اہل کتاب وحی اور کلام الہٰی کی حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ خود ان کی آسمانی کتابوں کی پیش گوئیوں اور بشارتوں کے مطابق بنو اسمٰعیل میں ایک نبی پیدا ہوگا اور اپنے ساتھ اللہ کی ایک کتاب بھی لائے گا۔ پس اگر یہ لوگ بھی قرآن کو وحی ماننے سے انکار کریں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان نہ لائیں تو ظاہر ہے ان سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتا ہے، چونکہ اسلام قبول کرنے کی توقع مشرکین کی بہ نسبت ان لوگوں سے زیادہ تھی اس لئے خدا نے حکم دیا کہ مسلمانوں کا معاملہ اہل کتاب کے ساتھ نرمی کا ہونا چاہیئے مسلمانوں کو ان سے کہنا چاہیئے کہ تم کو قرآن کے وحی ماننے میں کیا تامل ہے آخر تم بھی تو ہماری طرح ایک کتاب الہٰی پر ایمان رکھتے اور اسے منزل من اللہ مانتے ہو۔ دیکھئے کس بلیغ پیرایہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي	اور تم اہل کتاب سے صرف بطریق احسن مجادلہ
هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا	کرو ان میں سے ان لوگوں کے سوا جنھوں نے
مِنْهُمْ وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنزِلَ	(انکار حق کر کے) ظلم کیا ہے اور ان سے کہو کہ
إِلَيْنَا وَأُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلَٰهُنَا وَ	ہم ایمان لے آئے ہیں اس کتاب پر جو تم پر
إِلَٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ	نازل کی گئی اور اس پر بھی جو ہم پر نازل کی
مُسْلِمُونَ وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَا	گئی ہے اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے

اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ

(عنکبوت)

اور ہم اس کے مطیع و فرماں بردار ہیں اور اسی طرح ہم نے (اے محمد) آپ پر کتاب نازل کی پس جن لوگوں کو ہم نے کتاب دے رکھی تھی اور اس پر ایمان لے آئے ہیں اور ان اہل مکہ میں سے بھی بعض وہ ہیں جو اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں ہماری آیات سے جحود و انکار تو کافر ہی کرتے ہیں

مشرکین کے اعتراضات کی تردید پھر ان استدلات و ترغیبات پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ بعض دریدہ دہن مشرکین و کفار قرآن کی اس حیثیت پر جو اعتراضات کرتے تھے۔ ان سب کے بھی جوابات دئے گئے ہیں یہ لوگ کہتے تھے کہ اگر قرآن اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں نسخ نہ پایا جاتا۔ قرآن اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

(النحل)

اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جو کچھ نازل کرتا ہے وہ اسے خوب جانتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کلام گھڑنے والے ہیں (نہیں) بلکہ ان میں سے اکثر جانتے ہی نہیں ہیں

اور آنحضرت کو اس کے جواب میں یہ کہنے کا امر کیا جاتا ہے۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ

(النحل)

آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن کو میرے رب کی طرف سے روح القدس لیکر آئے ہیں تاکہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں انکو ثابت قدمی حاصل ہو اور مسلمانوں کیلئے ہدایت اور بشارت ہو۔

بعض کہتے تھے کہ حضور کا کوئی معلم ہے جو آپ کو یہ تمام باتیں سکھاتا ہے۔ اس قول میں یہ بہتان طراز خود دو قسم کے لوگ تھے کوئی کسی نصرانی غلام کو معلم بتاتا تھا اور کوئی کسی یہودی غلام کا نام لیتا تھا لیکن تھے یہ دونوں غلام عجمی اگر مشرکین کا یہ "معلم" عربی ہوتا تو وہ متعین طور پر اس کا نام لے سکتے تھے۔ قرآن مجید میں کفار کی اس بہتان طرازی اور اس کی تردید کا بیان اس طرح ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُولُونَ اِنَّمَا	اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مشرکین کہتے ہیں
يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِىْ	آپکو ایک انسان قرآن سکھاتا ہے (حالانکہ) جس
يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِىٌّ وَّهٰذَا	شخص کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں وہ عجمی ہے
لِسَانٌ عَرَبِىٌّ مُّبِيْنٌ (النحل)	اور قرآن کی زبان صاف اور واضح عربی ہے

اس کے بعد ان لوگوں کے جھوٹ پر مُہرِ توثیق اس طرح ثبت کی گئی ہے۔

اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا	یہ جھوٹ کا افترا وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ کی
يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ	آیات پر ایمان نہیں لاتے اور یہی وہ لوگ
هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (النحل)	ہیں جو جھوٹے ہیں۔

بعض مشرکین کا خیال تھا کہ قرآن مجید کا القا شیاطین کی طرف سے ہوتا ہے اور عموماً کاہن (Astrologer) غیب کی خبریں بیان کرتے ہی ہیں۔ آپ بھی کاہن ہیں اور اس لئے غیب کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس وسوسۂ شیطانی کی تردید بھی نہایت پرزور الفاظ میں کی ہے ارشاد ہے۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۙ وَمَا	اس قرآن کو شیاطین نے نہیں اتارا اور نہ یہ انکے
يَنْۢبَغِىْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (الشعرا)	لایق ہے اور نہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔
وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ	اور یہ قرآن مردود شیطان کا قول نہیں ہے

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ (التکویر) پس تم لوگ کہاں جا رہے ہو۔

قرآن کو بعض لوگ شاعرانہ کلام کہتے تھے۔ اس کی بھی تردید کی گئی۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ
وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ
(الحاقہ)

اور وہ قرآن کسی شاعر کا قول نہیں ہے تم بہت ہی کم ایمان لاتے ہو اور نہ وہ کسی کاہن کا قول ہے۔ تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو

ان سب اعتراضات اور شیطانی وساوس کی تردید کے بعد اللہ تعالیٰ خود اپنی اور فرشتوں کی شہادت سے قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ
اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ
وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا
(نساء)

لیکن اللہ کی شہادت دیتا ہے جو آپ پر نازل کیا گیا ہے اللہ نے اس کو اپنے علم سے اتارا ہے اور فرشتے بھی گواہ ہیں (اگرچہ) شہادت کے لئے تو اللہ ہی کافی ہے۔

مشرکین کا کوئی اور حیلہ کارگر نہیں ہوا تو انھوں نے یہی کہنا شروع کر دیا کہ بھلا یہ معجزہ ہی کیا ہوا نبی بھی عربی اور قرآن بھی عربی۔ اصل معجزہ تو جب ہوتا کہ عربی نبی پر عجمی قرآن نازل ہوتا۔ قرآن نے مشرکین کے اس قول کی رکاکت کا بھی اظہار کیا ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا
لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ
قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ
وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ
وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى اُولٰٓئِكَ

اور اگر ہم قرآن کو عجمی قرآن بناتے تو یہ لوگ کہتے کہ اس کی آیات مفصل کیوں نہیں ہیں بھلا زبان عجمی اور لوگ عربی۔ آپ کہہ دیجئے کہ قرآن ایمان والوں کیلئے ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ہیں ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور

يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ (حٰمٓ السجدہ) — یہ قرآن انکے حق میں اندھاپن ہی یہی لوگ ہیں جنھیں دور کی جگہ سے ندا دی جاتی ہے۔

بعض کفار خود اپنا منہ چڑانے کے لئے کہتے تھے کہ قرآن (معاذ اللہ) من گھڑت ہی اور دوسرے لوگوں نے اس میں آپ کی مدد کی ہے۔ قرآن اسکی بھی تردید کرتا ہی۔ ارشاد ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ هٰذَا اِلَّا اِفْكُ اِفْتَرَاهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَاۤءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا (الفرقان) — کافر کہتے ہیں کہ یہ قرآن تو کچھ بھی نہیں نرا بہتان ہے اور اس کے بنانے میں دوسرے لوگوں نے مدد کی ہے کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں نے بالکل جھوٹ اور ظلم کی بات کہی ہے۔

اوپر جو آیات گزریں دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کے وحی ربانی ہونے کے دلائل بیان کئے ہیں اور دوسری وہ آیات ہیں جن میں قرآن مجید سے متعلق کفار و مشرکین کے بیہودہ خیالات، باطل توہمات اور شیطانی وساوس کی پرزور تردید کی گئی ہی ان آیات کے علاوہ کثرت سے ایسی آیات بھی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بالکل صاف اور واضح الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ قرآن مجید کا نزول اللہ کی جانب سے ہوا ہے اس مضمون کے بار بار تکرار سے منشا یہی ہے کہ اسلامی عقائد و اعمال کا یہ اساسی عقیدہ اس طرح لوگوں کے دل و دماغ میں مرتسم ہو جائے کہ انھیں اس بارہ میں ذرا سا بھی تذبذب اور شک باقی نہ رہے آیاتِ ذیل ملاحظہ کیجیے۔

(۱) اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (دخان) — ہم نے بے شبہ اس قرآن کو مبارک رات میں اتارا

(۲) اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (قدر) — بے شبہ ہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا

(۳) تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى (طٰہٰ) — اس قرآن کا نزول اس ذات کی طرف سے ہی جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا

(۴) قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الفرقان)

آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن کو اس ذات نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھیدوں سے واقف ہے

(۵) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا

ہم نے ہی قرآن مجید آپ پر ٹھہر ٹھہر کر نازل کیا ہے

(۶) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

ہم نے ہی اس نصیحت (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

پورے قرآن کو اول سے آخر تک پڑھیے تو اس مضمون کی آیات چند ایک نہیں بلکہ بہت زیادہ ملیں گی واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے وحی ہونے کے مضمون کو جس شد و مد اور تاکید و تکرار سے بیان کیا ہے دنیا کی کسی اور کتاب سماوی نے اپنے متعلق اس طرح بیان نہیں کیا اس سلسلہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تشنہ تکمیل رہ گیا ہو۔

حضرت جبریل کی توثیق یہ ظاہر ہے کہ وحی اللہ کی طرف سے انبیا پر عموماً حضرت جبریل کے واسطہ سے نازل ہوتی رہی ہے اور خود قرآن بھی آنحضرت پر اسی طرح نازل ہوا۔ اس بنا پر قرآن میں حضرت جبریل کی وساطت کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور ان کی توثیق کر کے اس شبہ کو دور کر دیا گیا ہے کہ ممکن ہے ان سے پیغام الٰہی کے پہونچانے میں کوئی تغیر و تبدل ہو گیا ہو۔ ارشاد ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ)

آپ کہہ دیجئے کہ جو لوگ جبریل کے دشمن ہیں رہا کریں، انھوں نے ہی تو اللہ کے حکم سے آپ پر قرآن اتارا ہے

سورہ نحل میں ہے۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ

آپ کہہ دیجئے کہ اس کو روح القدس نے میرے رب کی طرف سے حق کیساتھ نازل کیا ہے تاکہ وہ ایمان

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِیْنَ — والوں کو ثابت قدم رکھے اور وہ مسلمانوں کیلئے ہدایت اور بشارت ہو

سورۂ شعراء میں انھیں روح الامین کہا گیا ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جبریل امین کامل ہیں ان سے کسی خیانت یا کوتاہی کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ فرمایا گیا ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ (الشعراء) — اس قرآن کو روح الامین (جبریل) نے آپکے قلب پر اتارا ہے تاکہ آپ انذار کرنیوالوں میں سے ہو جائیں۔

سورۂ تکویر میں اس سے بھی زیادہ تاکید کے ساتھ حضرت جبریل کی توثیق کیگئی ہے۔ ارشاد ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ — بیشک وہ معزز قاصد کا کلام ہے جو قوت والا ہے خدائے عرش کے نزدیک مرتبہ والا ہے اس کی اطاعت کی جاتی ہے اور وہاں امین و معتبر ہے

سورۂ النجم میں ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰی — آنحضرت کو سخت قوتوں والے اور زور آور نے سکھایا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق حضرت جبریل کے تعارف اور ان کی توثیق کے بعد ضرورت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی توثیق کی جاتی تاکہ کسی شخص کو یہ شبہ نہ ہو کہ ممکن ہے آپ سے وحی کے پہونچانے میں کوئی کوتاہی ہوگئی ہو ساتھ ہی ضروری تھا کہ اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حیثیت بھی بیان کردی جاتی جس سے یہ معلوم ہو جاتا کہ حضور تو محض ایک پیغامبر ہیں۔ اللہ کی طرف سے آپ پر جو وحی نازل ہوتی ہے آپ اس کو بے کم وکاست خدا کے بندوں تک پہونچانے پر مامور ہیں۔ پھر چونکہ اس منصب جلیل وعظیم (رسالت) کے لئے خدا نے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ اس لئے آپ کے ذہنی اور دماغی قویٰ بھی عام انسانوں سے زیادہ بلند اور مضبوط ہیں جس کے باعث آپ وحی میں نہ کوئی تغیر وتبدل کر سکتے ہیں اور نہ اس کے کسی لفظ اور معنیٰ کا مفہوم سمجھنے میں آپ سے

غلطی ہو سکتی ہے۔ رب الوحی نے یہ سب باتیں بھی قرآن میں بیان کی ہیں تاکہ لوگوں پر حجت تمام ہو جائے۔

قرآن کا افترا کیا ہی نہیں جا سکتا اس سلسلہ میں بعض آیات تو وہ ہیں جن میں عمومی طور پر فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآن سوائے اللہ کے کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس عموم کے ماتحت خود سرورِ کائنات کی ذاتِ ستودہ صفات بھی داخل ہے۔ مثلاً یہ آیت۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى	اور یہ قرآن وہ نہیں ہو کہ اس کو غیر خدا نے گھڑ لیا
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ	ہو بلکن اس کتاب کی تصدیق ہو جو اس سے پہلے
الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ	نازل ہوئی اور اس کی ہی تفصیل ہو اس قرآن کے
لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ	رب العالمین کی طرف سے ہونے میں کوئی شبہ نہیں

آنحضرت صلعم کے متعلق قرآنی تصریحات ان کے علاوہ دوسری آیات وہ ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے متعلق چند تصریحات و توضیحات ہیں ہم ذیل میں انھیں نمبروار لکھتے ہیں۔

(۱) ایک آیت میں بتایا گیا ہے کہ آپ بھی اور انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں فرق صرف یہ ہے کہ آپ پر وحی اترتی ہے۔

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ	آپ فرما دیجئے میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں البتہ مجھ پر وحی آتی ہے

اور آج یہ کوئی نئی بات نہیں ہو آپ سے پہلے بھی انبیاء آتے رہے اور ان پر وحی نازل ہوتی رہی ہو۔ بس آپ کا فرض منصبی یہی ہے کہ خدا کا پیام جوں کا توں لوگوں تک پہونچا دیں اس کے ماسوا آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ خود آپ کے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ "قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ" آپ خود وحی کا اتباع کرتے ہیں اور آپ تو صرف صاف صاف ڈرانے والے ہیں۔ اسی آیت کے آخر میں ہے۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوحٰی اِلَیَّ وَمَا اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ

(۲) حضور کو لوگوں کے ثواب و عقاب میں بھی کوئی دخل نہیں ہے ارشادِ خداوندی ہے۔

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ	آپ کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ اللہ
یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ اَوْ یُعَذِّبَ بَھُمْ	ان کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے یا ان کو عذاب
فَاِنَّھُمْ ظَالِمُوْنَ (نساء)	دے وہ تو بہر حال ظالم ہیں۔

(۳) حضور کو اس کا بھی علم نہیں ہے کہ خدا نے لوگوں سے جس چیز کا وعدہ کیا ہے وہ قریب ہے یا بعید ہے۔ فرماتے ہیں۔

قُلْ اِنْ اَدْرِیْ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ	آپ کہہ دیجئے میں نہیں جانتا کہ تم سے جس چیز
اَمْ یَجْعَلُ لَہٗ رَبِّیْ اَمَدًا	کا وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا نہیں یا میرا
(جن)	رب اس کے لئے کوئی مدت مقرر کرے گا

بعض مشرکین مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ آپ کی عام پند و نصائح تو بڑی عمدہ ہیں لیکن قرآن میں بت پرستی کی جو مذمت کی جاتی ہے اس سے تکلیف ہوتی ہے اس لئے آپ یا تو موجودہ قرآن کو چھوڑ کر کوئی دوسرا قرآن لے آیئے جس میں ایسی "دلخراش" باتیں نہ ہوں یا پھر کچھ اور نہیں تو اس قرآن میں ہی ترمیم اور تغیر و تبدل کر دیجئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی

قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ	جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی امید نہیں ہے یعنی
بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ ھٰذَآ اَوْ بَدِّلْہُ قُلْ	حشر کا عقیدہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ آپ
مَا یَکُوْنُ لِیْ اَنْ اُبَدِّلَہٗ مِنْ تِلْقَآئِ	اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آیئے یا
نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اِنِّیْ	اس کو بدل دیجئے آپ فرما دیجئے کہ میں قرآن کو
اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ	اپنی طرف سے بدل نہیں سکتا۔ میں تو

يَوْمٍ عَظِيمٍ	اسی چیز کی پیروی کروںگا جسکی وحی مجھ کو بھیجی گئی ہے
(یونس)	اگر میں نے نافرمانی خداوندی کی تو میں اپنے رب
	کے سخت دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحی کو بعینہ پہونچادیتے ہیں اور اس میں ہوا وہوس کا بالکل دخل نہیں ہوتا۔ اعلان واجب الاذعان ہے ۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ	آپ اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے آپ کا نطق
إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (النجم)	وحی ہے جس کی آپ پر وحی ہوئی ہے

(۵) اور آپ نطق عن الهوىٰ کر بھی نہیں سکتے ۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ	اور اگر وہ (محمد) بعض باتیں بنا کر ہماری طرف
لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا	منسوب کر دیتے تو ہم ضرور ان کا داہنا ہاتھ پکڑ
مِنْهُ الْوَتِينَ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ	لیتے پھر ان کی رگ کاٹ ڈالتے اور تم میں سے
عَنْهُ حَاجِزِينَ (الحاقہ)	کوئی اس کا روکنے والا نہ ہوتا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے ۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا	کیا وہ کہتے ہیں کہ محمد نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے
فَإِن يَشَإِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَىٰ قَلْبِكَ	اگر اللہ چاہتا تو وہ آپ کے دل پر مہر لگا دیتا
وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ	اللہ باطل کو مٹاتا اور حق کو اپنے کلمات سے
بِكَلِمَاتِهِ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (شوریٰ)	ثابت کرتا ہے بے شبہ وہ دلوں کے اسرار سے خوب واقف ہے

(۶) کوئی شبہ نہیں کہ آپ دیانت دار اور سچے قاصد ہیں اللہ کی وحی بعینہ لوگوں تک پہونچادیتے ہیں ۔

اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ ؎۱ (الحاقہ) کوئی شبہ نہیں کہ قرآن رسول کریم کا قول ہے

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھانا اور اس کو آپ کے سینۂ اقدس واطہر میں محفوظ رکھنا یہ سب اللہ کے ذمہ ہے اس بنا پر آپ سے اس کے یاد کرنے اور سمجھنے میں نہ کوئی غلطی ہو سکتی ہے اور نہ آپ کو اس میں کوئی سہو پیش آسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ سید کونین فداہ ابی وامی اس خیال سے کہ کہیں وحی الٰہی کا کوئی لفظ گوشۂ یاد سے اوجھل نہ ہو جائے نزول وحی کے وقت اپنی زبان حق ترجمان کو جلدی جلدی حرکت دیتے تھے تو خدا نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ارشاد ہے۔

لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ ؎۲

آپ جلدی جلدی پڑھنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجئے قرآن کا (آپ کے سینہ میں) جمع کرنا اور اس کا پڑھانا تو ہمارا ذمہ ہے جب ہم آپکو پڑھائیں تو آپ بھی اسکا اتباع کیجئے۔

؎۱ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہی سورۂ تکویر میں "رسول کریم" سے مراد جبریل ہیں لیکن سورہ الحاقہ میں "رسول کریم" سے مراد آنحضرت ہیں دونوں سورتوں میں "رسول کریم" کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے آنحضرت اور جبریل دونوں کو رسول اس لئے کہا گیا ہے کہ جبریل اللہ اور آنحضرت صلعم کے اور سرور دو عالم اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان نامہ بری (رسالت) کا فرض انجام دیتے ہیں اور چونکہ دونوں اپنے اپنے فریضۂ منصبی کے ادا کرنے میں نہایت دیانت دار اور امین ہیں اس لئے دونوں "رسول کریم" ہیں۔ کسی شخص کو قول کے لفظ سے اشتباہ نہ ہونا چاہیے کہ اس کی اضافت رسول کی طرف ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ قاصد کا قول اگرچہ اس کی زبان سے ادا ہوتا ہے اور اس لئے اس کا قول (مجازاً) کہلاتا ہے۔ لیکن در اصل وہ ہوتا ہے کلام اس شخص کا جس کا نامہ بر یہ قاصد ہوتا ہے۔

؎۲ کور چشمان باطن اگر آفتاب حقیقت کی ایک ہلکی سی کرن بھی دیکھ سکیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ قرآن مجید کے وحی الٰہی ہونے کے تمام دلائل ایک طرف اور صرف "لا تحرک بہٖ لسانک لتعجل بہٖ" ایک طرف یہ مختصر سی آیت اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہی کہ قرآن حضور کا اپنا کلام نہیں کون نہیں جانتا کہ کوئی متکلم کلام کرتے وقت اپنی زبان کو اس لئے جلد جلد حرکت نہیں دیتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے یاد رہ جائے (بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ)

ایک آیت میں ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى (الاعلیٰ)

ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہ بھولیں گے، مگر وہ جسے اللہ ہی چاہے۔ وہ کھلی اور چھپی باتوں کو جانتا ہے اور ہم آہستہ آہستہ آپ کو آسانی تک پہونچائیں گے۔

(۸) صرف پڑھانا اور یاد کرانا ہی نہیں بلکہ اس کی تشریح و توضیح بھی اللہ ہی کے ذمہ ہے

ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (القیمۃ)

پھر اس کو سمجھانا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بسلسلۂ وحی جتنے امور بحث طلب ہو سکتے تھے دیکھو قرآن نے کس طرح ان میں سے ایک ایک امر کے بارہ میں واضح تصریحات کی ہیں۔

قرآن آپ کے قلب پر نازل ہوا

ساتھ ہی اس نے نزول قرآن کی کیفیت بھی بیان کی ہے کہ اس کا تعلق حواسِ ظاہری سے نہیں بلکہ دل سے ہے ارشاد ہے۔

فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ

جبریل نے قرآن کو اللہ کے حکم سے آپ کے دل پر اتارا ہے

ایک اور مقام پر ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ

قرآن کو روح الامین آپ کے قلب پر لے کر نازل ہوئے ہیں تاکہ آپ ڈرانیوالوں میں سے ہوں

لوح محفوظ کا بیان

ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مطہر پر نازل ہونے سے پہلے لوح محفوظ میں موجود تھا۔ ارشاد ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یقینی بات ہے کہ حضور پر مبداء فیاض کی جانب سے قرآن مجید کا فیضان ہو رہا تھا اور آپ بہ تقاضائے بشریت اسے یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو جلد جلد حرکت دے رہے تھے اس پر حضرت حق جل مجدہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی

بَلْ ھُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (البروج) — بلکہ وہ قرآن مجید ہی جو لوح محفوظ میں ہے

اور صرف قرآن مجید میں نہیں بلکہ دنیا کے تمام واقعات واشیاء کا تذکرہ اس میں موجود اور ثبت ہے فرمایا گیا ہے۔

کُلَّ شَیْئٍ اَحْصَیْنٰہُ فِیْ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ (یٰس) — ہم نے تمام باتوں کو ایک واضح کتاب میں جمع کر دیا ہے۔

ایک آیت میں لوح محفوظ کو "کتاب مبین" کہا گیا ہے اور اس میں بھی اس کی اسی صفت کا بیان ہے۔

وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھَا اِلَّا ھُوَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَۃٍ اِلَّا یَعْلَمُھَا وَلَا حَبَّۃٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (الانعام)

اور اللہ کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو صرف اللہ ہی جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان چیزوں کو جو خشکی میں اور سمندر میں ہیں اور جو پتہ گرتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ گرتا ہے اللہ تعالیٰ ہی اس کو جانتا ہے اور کوئی تر اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں ہے جو کھلی ہوئی اور واضح کتاب میں نہ ہو۔

سورۂ حدید میں ارشاد ہوتا ہے۔

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ

ملک میں یا خود تمہارے اندر جو مصائب نازل ہوئے ہیں ان میں کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو اس کو پیدا کرنے سے پہلے لوح محفوظ میں محفوظ نہ ہو۔ یہ بے شبہ اللہ کے لئے آسان ہے

سورۂ القمر میں اس کا بیان اس طرح ہے۔

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ وَكُلُّ	اور ہر وہ چیز جو انھوں نے کی لکھی ہوئی ہے
صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُسْتَطَرٌ	ورقوں میں اور ہر چھوٹی بڑی چیز لکھی جا چکی

ان آیات کی روشنی میں قرآن مجید سے لوح محفوظ کی نسبت صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز ہے جس میں بدوِ آفرنیش سے انتہا تک کے تمام حالات و واقعات اوامر و نواہی اور رموز و اسرار لکھے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ قرآن بھی اُس میں لکھا ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں اتنی بات کا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن میں آلات کتابت و تحریر میں سے قلم کا بھی ذکر ہے ارشاد ہے

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ	ن، قسم ہے قلم کی اور اس کی جس سے لکھتے ہیں

لیکن اس لوح کی شکل و صورت کیسی ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن نے حسب دستور عرش و کرسی کی طرح اس کی بھی کوئی حقیقت بیان نہیں کی۔ البتہ بعض کتب احادیث میں اس کے متعلق حضرت ابن عباس کا ایک اثر ملتا ہے لیکن اس سے بھی کوئی حقیقت متعین نہیں ہوتی بعض لوگوں نے کہا ہے کہ لوح محفوظ ایک جوہر مجرد ہے کسی چیز میں نہیں اور وہ صور علمیہ کے لئے بمنزلہ آئینہ کے ہے لیکن کتاب و سنت کے ظواہر الفاظ سے اس کی بیّن تائید نہیں ہوتی۔ بطور تمثیل یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح حافظ قرآن کے دماغ میں قرآن مجید کے کلمات ثبت ہوتے ہیں لیکن وہ اس میں منقوش و مکتوب نہیں ہوتے اسی طرح لوح محفوظ میں تمام عالم کے مقادیر ثبت ہیں لیکن عام الواح دنیا پر قیاس کر کے ان کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس میں مقادیر منقوش ہیں۔ واللہ اعلم

قرآن کو کلام اللہ بھی کہا گیا ہے

پھر قرآن مجید کو صرف وحی کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اسے صاف لفظوں میں کلام اللہ بھی کہا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ	اور اگر کوئی مشرک آپ سے امن طلب کرے تو

فَاَجِرْهُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلَامَ اللّٰہِ — آپ اسکو امن دیدیجیۓ یہانتک کہ وہ اللہ کا کلام سنے

قولِ بشر کہنے پر عذاب دوزخ کی وعید

اب چونکہ حضرت جبرئیل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق کر کے قرآن کے وحی اور منزل من اللہ ہونے کے ثبوت میں اللہ کی طرف سے حجت تمام ہو چکی ہے اس لئے اب کسی منکر کا عذر لائق پذیرائی نہیں ہو سکتا اور جو شخص اب بھی قرآنِ کریم کو کلام بشر یا جادو کہتا ہے وہ بے شبہ دوزخ کے عذاب کا سزاوار ہے ایک مرتبہ ولید بن مغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے قرآن پڑھ کر سنایا وہ کسی قدر اس سے متاثر ہوا۔ مگر ابوجہل اور دوسرے سرداران قریش نے اس کو ورغلایا اور پوچھا قرآن کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ کہنے لگا " ذرا سوچ لوں" آخر تیوری بدل کر اور منہ بنا کر بولا " یہ تو بابل کا جادو ہے جو نقل ہوتا چلا آتا ہے" اور " یہ تو انسان کا قول ہے" اس پر قرآن مجید میں آیت ذیل اتری جس میں عذاب دوزخ کی وعید کی گئی ہے۔

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ نَظَرَ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ

اس نے سوچا اور دل میں ایک بات ٹھہرائی وہ مارا ہی جائے اس نے دل میں کیا بات ٹھہرائی تھی پھر وہ مارا ہی جائے اس نے کیا ٹھہرایا تھا پھر اس نے دیکھا تیوری چڑھائی اور منہ بھلالیا پھر پشت پھیر لی اور غرور کیا اور کہنے لگا " یہ تو جادو ہے جو منقول ہو کر آتا ہے یہ تو قولِ بشر ہی ہے۔

یہاں تک تو ولید بن مغیرہ کا مقولہ اور اس کے احوال وکوائف کا بیان تھا اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا — اب اس کو میں دوزخ میں ڈالوں گا اور آپ کیا

سَقَرُ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (المدثر)

سمجھے کہ کیسی ہے وہ دوزخ، وہ نہ کچھ باقی رکھتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے وہ آدمیوں کو جھلسا دینے والی ہے

قرآن مع عربی الفاظ کے وحی الٰہی ہے

اب صرف ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن جس کو اللہ کا کلام کہا گیا ہے وہ صرف معانی و مطالب کے لحاظ سے ہے یا عربی الفاظ اور ان کی مخصوص نشست و ترکیب کے لحاظ سے بھی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ لفظ و معنیٰ کی تفریق خاص عہد نبوت میں اُن لوگوں نے بھی نہیں کی جو رسول صادق و امین کی تکذیب کے لیے ایک ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتے تھے وہ خود ارباب لسان تھے۔ زبان کی فصاحت و بلاغت اور اسالیب بیان کی مہارت میں یگانۂ روزگار تھے اس کے باوجود قرآنی الفاظ کے اعجاز نے انھیں اس درجہ متاثر کر دیا تھا کہ وہ پورے قرآن کو تو مع اس کے الفاظ و معانی کے "ساحرانہ" کاہنانہ یا شاعرانہ کلام کہتے تھے لیکن یہ کہنے کی ہمت انھیں بھی نہیں ہوئی کہ "محمد (صلعم) کے الفاظ میں ایسی کونسی الوہی خصوصیت ہے کہ وہ انھیں بھی اللہ کا نازل کیا ہوا کہتے ہیں ایسے جملے اور ایسی عبارتیں تو ہم بھی بول اور لکھ سکتے ہیں۔

لیکن خدائے علام الغیوب کو علم تھا کہ اب نہیں تو بعد میں تفلسف اور عقلیت پرستی کے دور میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو ایک طرف اپنے مسلمان ہونے کا ادعا کریں گے اور دوسری طرف اپنے تفلسف کا بھرم قائم رکھنے کے لئے قرآن کو معانی و مطالب کے لحاظ سے تو وحی خداوندی تسلیم کرینگے لیکن اس کے الفاظ کی نسبت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں متامل نہیں ہونگے اس بنا پر قرآن مجید نے اس مسئلہ کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا اور اسکی بھی تصریح کر دی کہ قرآن مع الفاظ عربی کے اللہ کا کلام ہے اور اللہ کی طرف سے وحی کا نزول انھیں عربی الفاظ میں ہوا ہے

ارشاد ہے۔

قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ — قرآن عربی بغیر کسی کجی کے

علاوہ ازیں آیات ذیل غور سے پڑھیے۔

اِنَّا اَنْزَلْنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا — ہم نے قرآن عربی نازل کیا ہے

اِنَّا جَعَلْنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ — بے شبہ ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا ہے تاکہ تم سمجھو۔

وَکَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا — اور اسی طرح ہم نے اس کو قرآن عربی بنا کر اتارا ہے

وَکَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰہُ حُکْمًا عَرَبِیًّا — اور اسیطرح ہم نے اسکو عربی قرآن بنا کر اتارا ہے

دیکھئے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مطلق قرآن کے نزول کی نسبت اپنی طرف نہیں کی بلکہ اس قرآن کی نسبت اپنی طرف کی ہے جو عربی زبان میں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہونا بھی یہی چاہیئے تھا کیونکہ محض معانی و مطالب کے القاء و ایجاد کے کوئی معنی ہی نہیں ظاہر ہے کہ جس طرح معانی کا زبان سے اظہار بغیر الفاظ کے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح معانی کا دل میں خطور اور انکا تعین بھی الفاظ کے بغیر ناممکن ہے۔

تنقیحات و نتائج اب ان سب آیات کو سامنے رکھ کر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح قرآن مجید کی نسبت ایک ایک بات کو کھول کر بیان کیا ہے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس میں رمز یہی ہے کہ لوگوں کو قرآن مجید کے وحی الٰہی ہونے میں کوئی شک اور تردد نہ رہے یہی مسئلہ دین کی اساس اور بنیاد ہے اس لئے ضرورت تھی کہ اس پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا۔ ان تمام آیات سے حسب ذیل نتائج ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور معہ الفاظ و معانی کے۔

(۲) حضرت جبرئیل اسے لیکر نازل ہوئے ہیں۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ نازل ہوا ہے۔

(۴) جبرئیل اور آنحضرت دونوں بے انتہا امین اور دیانت دار ہیں۔

(۵) آنحضرت نے یا کسی اور شخص نے اس کو بنایا نہیں ہے۔

(۶) شیاطین نے اس کا القار نہیں کیا۔

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسول کریم تھے۔ قرآن آپ پر جیسا نازل ہوتا تھا ویسا ہی لوگوں تک پہونچا دیتے تھے۔ آپ کو اس میں نہ نسیان ہو سکتا تھا اور نہ کوئی مغالطہ۔

(۸) آپ شاعر کاہن، یا ساحران میں سے کچھ نہ تھے۔

(۹) قرآن کے منزل من اللہ ہونے کے دلائل قاطع کا بیان۔

(۱۰) اس پر کفار و مشرکین کے اعتراضات و وساوس کا حتمی رد۔

(۱۱) عام انسانوں تک اللہ کے اس کلام کے پہونچنے کا ذریعہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور آپ چونکہ ہر طرح اللہ کے معتمد اور اس کے سچے رسول ہیں اس لئے جو کلام آپ کی وساطت سے پہونچا ہے اور خود آنحضرت نے بھی اسے خدا کا کلام کہا ہے ہر انسان کا فرض ہے کہ بے چون وچرا اسے قبول کرے اور اس کے کلام اللہ ہونے پر ایمان لے آئے۔

مندرجہ بالا نتائج قرآن مجید کے اشارۃ النص یا دلالۃ النص سے نہیں بلکہ ظواہر نصوص سے واضح طور پر برآمد ہوتے ہیں اور اس بنا پر جس طرح کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول نہ مانے اسی طرح ایسے شخص کا ادعار اسلام صحیح نہیں ہے جو مندرجۂ بالا تنقیحات پر ایمان واعتقاد نہ رکھے۔ جمہور امت کا ہر قرن اور ہر زمانہ میں اس پر اتفاق رہا ہے اور جس کسی نے اس کا خلاف کیا اسے مرتد قرار دیکر گردن زدنی قرار دیا گیا ہے

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں " سلف ان لوگوں کو جہمی کہتے تھے جو صفات کی نفی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ قرآن مخلوق ہے اور یہ کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت نہیں ہوگی، کیونکہ جہم سب سے پہلا شخص ہے جس نے نفی اسماء و صفات کی بدعت جاری کی اور اس میں انتہائی غلو اور انہماک سے کام لے کر بار بار اس کی دعوت دی جعد بن درہم نے بھی مسلمانوں کو اس فتنۂ عظیم میں مبتلا کرنا چاہا تو خالد بن عبداللہ القسری نے جو عراق کا گورنر تھا عین بقر عید کے دن جعد کو ذبح کر دیا اور ذبح کرتے وقت یہ الفاظ کہے" لوگو تم اپنی اپنی قربانیاں کرو، اللہ تمہاری قربانیاں قبول فرمائے میں جعد بن درہم کو قربان کرتا ہوں یہ شخص اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا اور اس نے حضرت موسیٰ سے کلام بھی نہیں کیا تھا اللہ ان تمام چیزوں سے بلند و بالا ہے[1]۔

پس جہاں تک اسلامی عقائد کا تعلق ہے ہر اس شخص کے لیے جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے ناگزیر ہے کہ وہ قرآن مجید کو معہ الفاظ و معانی کے اللہ کلام مانے اور دل سے اس کا اعتقاد جازم رکھے۔ دنیا بھر کے تمام جزئی اختلافات کے باوجود یہی اعتقاد ایک ایسا رشتۂ اتحاد ہے جو دنیا کے تمام مسلمانوں کے درمیان ہر قرن اور ہر زمانہ میں قائم رہا ہے اگر کوئی مدعی اسلام آج اس اعتقاد پر قائم نہیں ہے تو جس طرح زمانۂ سلف میں ایسے گمراہ لوگوں کو مسلمانوں کی برادری سے خارج کر دیا گیا تھا۔ یہ شخص بھی ہمارے اسی سلوک کا مستحق ہونا چاہیئے "۔

---

[1] رسالہ صفتہ الکلام مطبع منیری مصر ص ۳۲

خدا کی صفاتِ ذاتیہ پر ایک عام بحث

موجودات کی تین قسمیں ہیں (۱) وہ ذوات جن کا وجود خارج میں متحقق ہو (۲) افعال جو ذوات سے صادر ہوتے اور معقولات میں پائے جاتے ہیں (۳) صفات جو ذوات کے حالات ہوتی ہیں۔ وجود کے اعتبار سے ان تینوں میں فرق یہ ہو کہ ذوات کا وجود خود ان کے ساتھ قائم ہوتا ہے یعنی ان کا وجود اضافی نہیں بلکہ حقیقی ہوتا ہے اس کے برعکس افعال کا وجود فاعل کے وجود پر موقوف ہوتا ہے۔ ورنہ فی حد ذاتہ ان کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اب رہی صفات تو ان کی حقیقت یہ ہو کہ یہ ان حالتوں یا کیفیتوں کا نام ہو جو ذوات میں پائی جاتی ہیں اور صفات کا وجود ذوات میں ان کے ساتھ ساتھ اور ان کی وجہ سے ہی ہوتا ہو۔ افعال میں اور صفات میں فرق یہی ہو کہ صفات کا قیام ذات کے ساتھ ہوتا ہو اور افعال کا صدور اگرچہ فاعل سے ہوتا ہے لیکن ان کا قیام و بقا فاعل کی ذات کے ساتھ نہیں ہوتا۔ پہلی قسم کی مثال انسان ہو۔ دوسری قسم کی مثال حرکت اور تیسری نوع کی مثال حیا، سخاوت اور شجاعت وغیرہ ہے۔

یہ مسلم ہے کہ کوئی موجود بھی، خواہ وہ ذات ہو یا صفت ہو یا فعل ہو اس کا وجود بہرحال از خود نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مصدر و منبع ذات واجب الوجود ہو پھر یہ بھی مسلم ہے کہ موجوداتِ ثلاثہ میں اولاً وجود ذوات کا ہوتا ہو پھر صفات کا اور ان کے بعد افعال وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اب اس پر اس ایک مقدمہ کا اور اضافہ کیجیے کہ صفات و حالات دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو اشیاء کے لئے بذواتہا پائے جاتے ہیں یعنی کسی شے کا وہ شے ہونا ہی ان صفات کے وجود کی سب سے

بڑی دلیل ہوتا ہے اور اس کے لئے کسی اور علت موجبہ کی احتیاج نہیں ہوتی اس کے علاوہ دوسری قسم کی صفات وہ ہیں جن کے وجود کے لئے محض کسی شئے کا شے ہونا کافی نہیں ہوتا، بلکہ ان کا وجود کسی علت وسبب موجب کا محتاج ہوتا ہے۔ پہلی قسم کی مثال یہ ہے کہ جیسے گرمی آگ کے لئے اور ٹھنڈک برف کے لئے ظاہر ہے کہ محض آگ کا آگ ہونا اور برف کا برف ہونا وجودِ حرارت وبرودت کے لئے کافی ہے اس کے لئے کسی علت خارجی کی ضرورت نہیں یا مثلاً یہ کہ ہر مثلث کے تین زاویے اس کے دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں یہ بالکل صاف ظاہر ہے کہ محض مثلث کا مثلث ہونا یعنی اس کی ہُویّت ہی اس کی اس صفت کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس کے تینوں زوایا دونوں قائموں کے برابر ہیں۔

دوسری قسم کی صفات کی مثال یہ ہے کہ جیسے آگ کے قریب ہونے کی وجہ سے پانی میں حرارت کا یا برف ڈلنے سے اس میں برودت کا پیدا ہو جانا جو صفات کسی شئے کے لئے لذاتہ ہوتی ہیں، ان کو طبیعت اور خاصیت کہا جاتا ہے ان صفات کے حصول فی الذات کے لئے نفس ذات کے سوا نہ کوئی سبب خارجی ہوتا ہے اور نہ کوئی اور صفت ہی اس کے لئے سبب بنتی ہے، افعال کا ذوات سے جو صدور ہوتا ہے وہ انھیں طبائع اور خواص کے مطابق ہوتا ہے جو ذات کے لئے صفات اولیہ وذاتیہ کہلاتے ہیں۔

اس تمہید سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ کسی شئے کے لئے جو صفات ذاتیہ ہوں گی وہ اس ذات کے ساتھ ساتھ پائی جائیں گی خواہ ان صفات کا اس ذات سے صدور ہوا ہو یا نہ ہو۔ مثلاً جو شخص سخی ہے جب تک وہ موجود ہے سخی کہلائے گا یا جو شخص بہادر ہے بہر حال وہ بہادر ہی خواہ اس سے اب تک شجاعت اور سخاوت کا عملاً صدور نہ ہوا ہو۔ کیونکہ سخی اور شجاع ہونے کے معنی یہ ہیں کہ سخاوت اور شجاعت کے موقع پر یہ شخص سخاوت اور شجاعت کے جوہر دکھائیگا تو ہمارا یہ کہنا خود اس بات کی

دلیل ہے کہ ہم نے صدورِ فعل سے پہلے ہی اس کو وصفِ شجاعت وسخاوت کے ساتھ متصف مان لیا ہو زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک کسی شخص سے ملکہ سخاوت وشجاعت کا عملی اظہار وصدور نہ ہوگا۔ ہم اس کو کس طرح سخی یا شجاع کہہ سکتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی شے کے متعلق ہمارا عدم علم اس شے کے عدم کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ نے کسی فصیح وبلیغ مقرر وخطیب کی تقریر دلپذیر اب تک نہیں سُنی ہو۔ تو یہ کس طرح اس بات کی دلیل بن سکتا ہو کہ وہ مقرر وخطیب سرے سے فصیح وبلیغ ہی نہیں ہو۔ اس سے یہ نتیجہ صاف طور پر نکل آتا ہو کہ خدا میں جو صفات پائی جاتی ہیں اسکے وجود کیلئے تخلیق عالم کی ضرورت نہیں ہو۔ اسمیں صفتِ خلق ورزق کا پایا جانا اسکا علیم ہونا متکلم ہونا اور اسکا صفت سمع وبصر سے متصف ہونا اس پر موقوف نہیں ہو کہ اس کے بالمقابل کوئی شے مرزوق اور مخلوق وغیرہ بھی پائی جائے بلکہ وہ اپنی تمام صفات کمالیہ سے علیٰ وجہ التمام والکمال اسوقت بھی متصف تھا جبکہ صرف وہ ہی وہ تھا اور اسکے علاوہ تمام چیزیں "ولم یك شیئا مذکورًا" کے حجاب غلیظ میں مستور تھیں۔

اب رہی یہ بات کہ خدا میں کون کون سی صفات پائی جاتی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جس ذاتِ گرامی کو خدا کہتے ہیں وہ تمام صفات کمالیہ کی متجمع ہے اور اس کی واضح ترین دلیل یہ ہو کہ جس طرح ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے متبنی کا مشہور مصرعہ ہے۔

وبضدھا تتبین الاشیاء

اسی طرح کسی چیز کا ناقص ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے بالمقابل کوئی اور کامل چیز پائی جا رہی ہی پھر یہ ظاہر ہو کہ کمال اور نقص دو قسم کے ہوتے ہیں ایک حقیقی اور دوسرا اضافی۔ کمال حقیقی سے مراد یہ ہے کہ وہ سرتاپا کمال ہی کمال ہو اور اس میں ادنیٰ سا شائبہ نقص بھی نہ پایا جائے اسی طرح نقص حقیقی کے معنی یہ ہیں کہ وہ سربسر ناقص وغیر مکمل ہو اور اس میں کمال کی ہلکی سی آمیزش بھی نہ ہو ان دونوں کے درمیان نقص وکمال اضافی کا وجود ہوتا ہے جس کے مراتب بے شمار

نکلتے ہیں پس جس طرح ہمارا وجود ناقص ایک کامل اور ابدی و ازلی وجود کا پتہ دے رہا ہے اسی طرح ہماری صفاتِ کمال کا نامکمل و ناقص ہونا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ بالیقین کوئی ذاتِ گرامی ایسی موجود ہے جس میں یہ تمام صفات کمال کے مرتبۂ قصویٰ کے ساتھ پائی جائیں اور اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ ذات بجز اس کے کوئی اور نہیں ہے جو سرچشمۂ وجود اور مبداء فیاض عالم ہے

خدا کے لئے اثبات صفات کمالیہ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ انسان میں جو صفاتِ کمالیہ پائی جاتی ہیں وہ ظاہر ہے کہ انسان کے لئے اصلی اور ذاتی نہیں ہیں اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جو شئے اصلی اور ذاتی نہیں ہوتی وہ کسی غیر کی معلول ہوتی ہے اس بنا پر لامحالہ ہماری تمام صفاتِ کمال کسی غیر کا معلول ہوں گی اور آخر کار یہ سلسلہ کسی ایسی ذات پر منتہی ہوگا جو تمام اشیاء کی علت تامہ و مطلقہ ہے اور خود وہ کسی کا معلول نہیں ورنہ پھر دور یا تسلسل لازم آئے گا اور چونکہ یہ ذاتِ گرامی صفتِ وجود میں اکمل ہے۔ اس لئے اس کی ہر ہر صفتِ کمال بھی ایسی ہی اکمل ہوگی۔

اب مذکورۂ بالا تقریر کو اوّل سے آخر تک پھر ایک مرتبہ غور و خوض سے پڑھئے تو یہ نتیجہ بالکل بدیہی طور پر نکل آتا ہے کہ

(۱) خدا کی ذات مستجمع ہے تمام صفاتِ کمالیہ کو

(۲) یہ تمام صفات اس کی ذات کے ساتھ قائم اور ازلی و ابدی ہیں۔

صفات کی حقیقت ہم خدا کی صفات کی نسبت صرف اتنا ہی جان سکتے ہیں اور جاننا چاہئے اس سے متجاوز نہ ہو کر اگر آپ یہ پوچھیں کہ ان صفات کی حقیقت کیا ہے اور ان کا قیام ذات باری کے ساتھ کس نوعیت کا ہے تو ہم اس کے جواب میں صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم صفاتِ باری کو اپنی صفات پر قیاس نہیں کر سکتے یعنی ہم جس طرح یہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے بھی وجود ہے اور خدا کے لئے بھی لیکن با ایں ہمہ ہم پورے وثوق اور یقین سے جانتے ہیں کہ خدا کا وجود ہمارے

وجود کی طرح نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم کو یقین رکھنا چاہیئے کہ خدا پر اور ہم پر صفاتِ کمال کے لفظی اطلاق کے باوجود ہماری ان صفات کو خدا کی صفات پر کسی طرح قیاس نہیں کیا جا سکتا مثلاً یوں سمجھئے کہ خدا کو رحمان اور قہار کہا جا سکتا ہے اور وہ بے شبہ ان صفات کے ساتھ بدرجۂ اتم موصوف ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اس کا رحم اور قہر ہمارے رحم اور قہر کے مانند نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ رحم اور قہر کے مفہوم میں تاثر و انفعال داخل ہیں یعنی ہم کسی پر رحم کرتے ہیں تو یہ نتیجہ ہوتا ہے ہمارے نفس کی رقت کا جو کسی قابل رحم چیز کو دیکھ کر ہمارے اوپر طاری ہو جاتی ہے اسی طرح قہر ہمارے نفس کے ہیجان و ثوران کا ثمرہ ہوتا ہے جو کسی ناگوار طبع چیز کے دیکھنے سے ہمارے احساس و شعور پر مستولی ہو کر قوت غضبی کو برانگیختہ کر دیتا ہے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ رحم اور قہر دونوں کی تعریف میں مبدا اور غایت کے لحاظ سے دو چیزیں شامل ہیں مبدا کے مرتبہ میں انفعال و تاثر ہے اور غایت کے درجہ میں فعل و تاثیر اور چونکہ خدا کی ذات انفعال و تاثر سے منزہ ہے اس لئے اس کا رحمٰن و قہار ہونا صرف غایت کے لحاظ سے ہے مبداء کے اعتبار سے نہیں یہ ایک ایسی واضح بات ہے کہ کسی سلیم الطبع انسان کو نہ اس سے انکار ہو سکتا ہے اور نہ کوئی شک و شبہ اسی پر خدا کی دوسری صفات مثلاً علم، ارادہ مشیت قدرت اور کلام کو قیاس کر لیجئے۔ ان کمالات کا اطلاق جن معانی سے ممکنات پر ہوتا ہے خدا پر نہیں ہو سکتا۔

اب اس امر کو تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم خدا کی صفات کی نسبت صرف اتنا ہی جان سکتے ہیں کہ خدا میں یہ صفات پائی جاتی ہیں۔

دور بینانِ بارگاہ الست   غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

باقی رہا یہ سوال کہ کیونکر اور کس طرح؛ تو ہم اس کی نسبت کچھ نہیں بتا سکتے کیونکہ کوئی چیز

ایسی موجود نہیں ہے جس پر ہم خدا کی ذات وصفات کو قیاس کر سکیں اس کے لئے نہ کوئی ند (مثل) ہے اور نہ ضد۔ اس نے خود فرمایا ہے "لَیسَ کَمِثلِہ شَیئٌ" اکبرالہ آبادی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا   بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے،

پھر ذرا اس پر بھی غور کیجیے کہ خدا کی ذات وصفات کا کیا ذکر، خود ہمارے اندر کتنی باطنی قوتیں اور ملکات ہیں جن کو ہم اُن کے آثار سے پہچانتے ہی نہیں بلکہ ان کے وجود کا یقین رکھتے ہیں، اور اس کے باوجود ہم اُن کی حقیقت وماہیت سے بے خبر ہیں خود علم کو لیجیے، بچہ بچہ اور جاہل سی جاہل انسان بھی علم کی فضیلت اور برتری کا معترف ہے لیکن علم انسانی کی حقیقت کیا ہے وہ صورت حاصلہ فی العقل ہے یا حصول صورت کا نام علم ہے یا خود قوتِ مدرکہ کو علم کہتے ہیں یا عالم اور معلوم کے درمیان جو نسبتِ رابطہ ہے وہ علم ہے علم کے سلسلہ میں یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جن کا قطعی اور حتمی جواب آج تک نہیں دیا جا سکا، نفس ناطقہ انسانی کو سب یہ کہتے ہیں کہ وہ مبداء ادراک ہے کلیات وجزئیات کے لئے عقل کو دنیا جانتی ہے کہ وہ انسان کے لئے سب سے بڑا طغراء شرف وامتیاز ہے روح کے متعلق کس کو خبر نہیں کہ زندگی کا دارومدار اس کے اتصال بالجسم پر موقوف ہے لیکن جب سوال کیا جاتا ہے کہ نفس ناطقہ کیا ہے عقل کی حقیقت وماہیت کیا ہے روح کی حد تام کیا ہے تو ان سوالات کے جواب میں فلاسفہ کے نظریات اس درجہ مختلف نظر آتے ہیں کہ ان کی روشنی میں کسی ایک قطعی نتیجہ تک پہونچنا دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے پس جب ان چیزوں کی نسبت ہمارا علم اس قدر محدود ہے تو پھر ظاہر ہے کہ خدا کی ذات وصفات کے بارہ میں ہماری رسائی کہاں تک ہو سکتی ہے کسی نے سچ کہا ہے۔

تو بر اوج فلک چہ دانی چیست   چوں ندانی کہ در سرائے تو کیست

صفت ذات اور صفتِ فعل آپ پڑھ آئے ہیں کہ صفات دو قسم کی ہوتی ہیں ایک صفات ذاتیہ

جو ذات کے ساتھ قائم ہوتی ہیں اور دوسری وہ جو ذات کے ساتھ قائم نہیں ہوتیں خدا کی صفات بھی دو قسم کی ہیں علامہ ابن تیمیہ ان کو صفتہ ذات اور صفتِ فعل سے تعبیر کرتے ہیں خدا کی صفاتِ ذاتیہ کا تعلق اس کی ذات کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے پھول کے ساتھ رنگ و بو آفتاب کے ساتھ حرارت اور روشنی پانی کے ساتھ برودت اور آگ کے ساتھ گرمی کا تعلق و قیام ہے رہی صفتِ فعل تو یہ وہ صفت ہے جو کسی معلول یا مفعول کے ساتھ تعلق کی وجہ سے خدا کے لئے حاصل ہوتی ہے مثلاً آگ کی ایک تو صفتِ حرارت ہے جو اس کے لئے ذاتی ہے۔ جب آگ کا وجود ہوگا حرارت ضرور پائی جائے گی اور ایک صفت ہے جلانا تو ظاہر ہے کہ یہ صفت اس رابطہ پر دلالت کرتی ہے جو آگ کے اور کسی اور چیز کے درمیان پایا جاتا ہے اس پر ہی خدا کی صفتِ فعل کو قیاس کر لیجئے یعنی یہ صفت کسی خاص فعل کے اعتبار سے اس تعلق کو ظاہر کرتی ہے جو خدا اور اس کے بندہ کے درمیان ہوتا ہے اس صفت کی نسبت دو باتیں بالکل واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ صفت ذات کی طرح اس صفت کا موصوف بھی ذات ہی ہوگی کیونکہ جس طرح صفتِ ذات کا قیام و تعلق ذات کے ساتھ ہے اسی طرح اس صفت کا مبداء صدور بھی ذات ہی ہے دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ صفتِ فعل، صفت ذات کا ہی پر تو ہوتی ہے، لیکن چونکہ یہ صفت اس تعلق کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جو کسی دوسری شے کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے اس صفت کو ذاتِ موصوف کے ساتھ وہ تعلق نہیں ہوتا جو صفتِ ذات کو ہوتا ہے اس بنا پر اس صفت کا ظہور جو مختلف اشکال و صور میں ہوتا ہے اس کا اثر ذات پر کچھ نہیں ہوتا یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صفت کی وجہ سے ذاتِ موصوف میں کوئی تغیر پیدا ہوگیا ہے۔

تعدد صفات اور وحدانیتِ ذات

اس تقریر سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ خدا کے لئے متعدد صفات کا پایا جانا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ خود اس کی ذات میں بھی تعدد یا ترکب پایا جائے۔ کیونکہ

ہم مخلوقات میں دیکھتے ہیں کہ کثافت کے باوجود متعدد اشیار کے اعتبار سے ایک شے کیلئے ہزاروں صفات والقاب ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کسی کا باپ کسی کا بھائی، کسی کا خاوند کسی کا چچا اور کسی کا بھتیجہ کہلاتا ہے۔ ان تمام مختلف القاب کے باوجود یہ شخص شخص واحد ہی رہتا ہے اور اس کے ایک ہونے میں فرق نہیں پڑتا پس جب کثیف چیزوں کا یہ حال ہے تو ظاہر ہے خدا کی صفات کے تعدد سے اس کی ذات میں کس طرح تعدد پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ تو تمام موجودات سے زیادہ لطیف بلکہ سرچشمۂ لطافت ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہ نسبت کثیف کے لطیف میں تعدد و تکثر بہت کم ہوتا ہے اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ وہی ایک ذاتِ خداوندی ہے جو کسی جہت سے خالق کسی وجہ سے رازق اور کسی لحاظ سے متکلم اور کسی اعتبار سے رحمٰن اور قہار و جبار ہے۔

اسی حقیقت کو ایک اور واضح تر مثال سے سمجھیے آفتاب کو طلوع کے وقت دیکھئے کتنا بڑا اور انگاروں کی طرح سرخ اور بے شعاع نظر آتا ہے پھر بلند ہو کر سفید دکھائی دیتا ہے اور مقدار میں چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب غروب ہونے لگتا ہے تو زرد بن جاتا ہے، ان سب صورتوں میں یونہی کہتے ہیں کہ آفتاب کو دیکھا اب غور کیجیے کیا یہ تمام تغیرات ذاتِ آفتاب میں ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہ زردی، سرخی، مقدار کا بڑا ہونا اور چھوٹا ہونا یہ سب ہماری نظر کے تاثرات و انفعالات ہیں جو آفتاب کے ایک خاص جہت میں نظر آنے اور اس کی شعاعوں کے زمین پر عمودی شکل میں یا ترچھے پڑنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ورنہ آفتاب ان تمام حالات میں یکساں رہتا ہے اور اس کی مقدار میں نہ زیادتی ہوتی ہے اور نہ کمی پس جس طرح آفتاب ایک متعین رنگ رکھنے کے باوصف، مختلف الوان و صُور میں جلوہ نما ہوتا ہے اور طرح طرح سے تجلی کرتا ہے۔ ایسے ہی حضرت باری عز اسمہٗ ذاتِ واحد ہے اس میں کسی قسم کا تعدد نہیں، لیکن بایں ہمہ تجلیاتِ متعددہ رکھتا ہے اور ان تجلیات سے کام صفات

کا نکلتا ہے۔

صفات کا ظہور حوادث میں | اس تقریر سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ خدا کی صفات کا ظہور حوادث کی شکل وصورت میں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم ان حوادث پر قیاس کر کے صفات کو حادث نہیں کہہ سکتے وہ بدستور قائم ہی رہیں گی اور اگرچہ تجلی کی صورت میں صفات کے لئے بظاہر تغیر و تبدل پایا جائے گا لیکن یہ محض نظر کا دھوکا ہوگا ورنہ در اصل وہ غیر متغیر و غیر متبدل ہیں مثال کے لئے ایک ایسی لالٹین کا تصور کیجئے جو ہشت پہلو ہو اس کے چاروں طرف آٹھ مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہوئے ہیں اور ان سب کے اندر ایک چراغ رکھا ہوا ہے اب دیکھئے چراغ کے لئے ایک روشنی تو وہ ہے جو چراغ کی ذات کے ساتھ قائم ہے یہ روشنی مطلق ہے کسی رنگ یا کسی مقدار کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک روشنی وہ ہے جو رنگین شیشوں کے عکس سے چھن چھن کر مختلف رنگوں کے ساتھ نظر آرہی ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں روشنیاں چراغ کی ہیں کیونکہ سبز یا سرخ روشنی کو کوئی نہیں کہتا کہ یہ سبز یا سرخ شیشہ کی روشنی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ پہلی قسم کی روشنی (مطلق روشنی) ذاتِ چراغ کے ساتھ قائم ہے۔ کوئی شیشہ نہیں ہوگا۔ تب بھی یہ روشنی پائی جائے گی، لیکن دوسری روشنی کے ظہور و قیام کا تعلق شیشہ کے ساتھ ہے۔ چنانچہ اگر آپ ان آٹھوں شیشیوں میں سے کوئی شیشہ لالٹین سے نکال لیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس شیشہ کے رنگ کی روشنی بھی یک بیک غائب ہو جاتی ہے اس مثال میں تین باتیں خاص طور پر لائق توجہ ہیں۔

(۱) جتنے مختلف رنگوں کی روشنیاں نظر آرہی ہیں وہ سب شمع کی ہیں۔

(۲) شمع کی روشنی بذاتِ خود ان رنگوں میں سے کسی خاص رنگ کے ساتھ مقید نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ شمع کی روشنی کا مختلف رنگوں میں نظر آنا شیشوں کی وجہ سے ہی ہے۔

(۳) رنگ اور روشنی دونوں الگ دو چیزیں ہیں لیکن دونوں میں تعلق یہ ہے کہ روشنی ظاہر

ہے اور رنگ مظہر یا دوسرے لفظوں میں یہ کہئے کہ روشنی متجلی ہے اور رنگ متجلی فیہ اور اس تعلق کے باعث دونوں میں ارتباط اس درجہ شدید ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اس میں خاص طور پر لحاظ کے قابل چیز یہ ہے کہ روشنی کا سرخ یا سبز ہونا شیشہ پر روشنی کا پرتو پڑنے کی وجہ سے ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ روشنی کے لئے بذاتہ کوئی رنگ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود سرخی یا سبزی کی صفت ثابت ہوتی ہے روشنی کے لئے ہی نہ کہ شیشہ کیلئے کیونکہ یہاں روشنی اور رنگ میں ذاتاً الگ الگ ہونے کے باوجود اس قدر زبردست اختلاط وارتباط ہے کہ گویا دونوں ایک ہی ہیں اور ان میں سے ایک کا قیام دوسرے کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ صفت ذاتی کا قیام و تعلق موصوف کے ساتھ جن سطور پر خط کھینچا ہوا ہے ان کو بار بار پڑھئے اور غور کیجئے تو آپ کو صفاتِ خداوندی کی تجلی اور حوادث کی شکل میں ان کے ظہور پر بڑی بصیرت حاصل ہوگی اور بڑے بڑے خدشات و وساوس کا حل معلوم ہو جائے گا۔

مزید توضیح کی غرض سے ایک اور مثال نقل کرتا ہوں جس سے اصل مسئلہ پر زیادہ روشنی پڑتی ہے آپ روزانہ دیکھتے ہیں کہ کسی ریڈیو اسٹیشن سے ایک تقریر نشر کی جاتی ہے اور آپ اسے اپنے ریڈیو سٹ میں سنتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ریڈیو سٹ میں ایک پیچ لگا ہوا ہوتا ہے جس کو انگریزی میں وولیوم کنٹرول (Volie me Controll) کہتے ہیں اور جس سے آواز کو کم یا زیادہ کرنے کا کام لیا جاتا ہے اب اس پر غور کیجئے کہ جہاں تک آواز کا تعلق ہے وہ بالکل یکساں ہی یعنی مقرر ایک ہی آواز سے اول سے آخر تک اپنی تقریر کو پڑھتا چلا جاتا ہے اس میں نہ تیزی پیدا ہوتی ہے اور نہ ہلکا پن لیکن ادھر حال یہ ہے کہ آپ اس پیچ کو دو ایک چکر دیتے ہیں تو آواز ہلکی اور مدہم نکلتی ہے اور اگر اس کو زیادہ گھماتے ہیں تو آواز بلند ہو جاتی ہے اب یہ ظاہر ہے کہ آواز کا ہلکا ہونا یا تیز ہونا آواز کی ذاتیات میں داخل نہیں ہے اور آپ کے پیچ گھمانے سے مقرر کی اصل

آواز میں کوئی تغیر بھی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ہلکاپن یا تیزی صفت کس کی ہے؟ آواز کی ہی یا کسی اور چیز کی؟ ظاہر ہے کہ آواز ہی کی صفت ہے اور دلیل یہ ہے کہ آپ آواز کے گھٹنے بڑھنے پر بے تکلف بول اٹھتے ہیں کہ آواز کم ہو گئی یا زیادہ ہو گئی۔

چونکہ صفاتِ ایزدی کی تجلی کا مسئلہ نہایت دقیق ہے اور اس کی تشریح و توضیح فلسفیانہ اصطلاحات کی روشنی میں بہت ہی مشکل ہے۔ چنانچہ عرفی نے کہا ہے۔

نورِ حیرت در شبِ اندیشۂ اوصاف تو　　　بس ہمایوں مرغ عقل از آشیاں انداختہ

اور ہونا بھی یہی چاہیئے بھلا ایک قطرہ بے مقدار کس طرح بحر ناپیدا کنار کو اپنی آغوش میں لے سکتا ہے اس بنا پر اس حقیقت کے افہام و تفہیم کے لئے بہترین طریقہ مثالوں کا ہی ہو سکتا ہے ہم ذیل میں ایک اور مثال کے ذریعہ اس کی تشریح کرتے ہیں آفتاب کی روشنی کو دیکھئے اس کے لئے کوئی خاص مقدار یا شکل نہیں پائی جاتی لیکن اس کا گذر ایسے روشن دان سے ہو جو مثلث یا مربع شکل کا ہے تو خود آفتاب کی روشنی بھی اسی شکل سے متشکل ہو جاتی ہے اب غور کیجئے روشنی اور یہ شکل دو مختلف چیزیں ہیں لیکن صورت یہ ہے کہ روشنی کا گذر روشن دان میں سے ہو رہا ہے اور روشن دان ایک خاص شکل رکھتا ہے۔ روشن دان میں سے گذرنے کی وجہ سے یا بالفاظ صحیح تر روشن دان کو اپنا جلوہ گاہ بنانے کے باعث روشن دان کی شکل خاص خود روشنی کے لئے حاصل ہو گئی اور آپ اس شکل کا حمل و اتصاف روشنی کے لئے ایسا ہی کرتے ہیں کہ گویا وہ روشنی کے لئے کوئی صفتِ ذاتی ہے

صفات لاعین ولاغیر ہیں | مذکورہ بالا مثالوں پر غور کرنے سے علم کلام کے ایک مشہور و معروف مسئلہ کا بھی حل نکل آتا ہے یعنی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ صفات باری تعالیٰ کو ذاتِ باری سے ایسی نسبت ہے کہ نہ ان کو عین ذات کہہ سکتے ہیں اور نہ غیر ذات کیونکہ سرخی یا سبزی روشنی سے مثلث یا مربع شکل آفتاب کی دہوپ سے کمی یا زیادتی آواز سے غیر بھی ہیں اور عین بھی۔ غیر اس اعتبار سے کہ یہ چیزیں

موصوف کی ذات کا عین نہیں ہیں۔ شمع کی روشنی پائی جاتی ہے اور سرخی یا سبزی کا وجود نہیں ہوتا۔ دھوپ کا وجود پایا جاتا ہے اور شکل مثلث یا مربع کا کہیں پتہ نہیں ہوتا اور عین اس بنا پر ہیں کہ شمع کی روشنی جب تک رنگین شیشوں کے درمیان محصور ہے اور آفتاب کی دھوپ جب تک مثلث یا مربع شکل کے روشن دان میں سے گذرتی رہے گی بہر حال شمع کی روشنی کے لئے رنگین اور دھوپ کے لئے مثلث یا مربع ہونا ضروری ہے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کا انفکاک دوسرے سے نہیں ہو سکتا۔

حوادث کا قیام ذاتِ باری سے

اس تقریر سے ایک اہم مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ متکلمین عام طور سے کہتے ہیں کہ حوادث کا قیام ذاتِ باری کے ساتھ نہیں ہو سکتا یہ کہنے کی بنا پر خدا کی صفات فاعلی کے متعلق طرح طرح کے اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک کلام کے مسئلہ کو ہی لے لیجئے اگر یہ مطلقاً درست مان لیا جائے کہ ذاتِ باری کے ساتھ حوادث کا تعلق اور قیام ناجائز ہے تو اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر قرآنِ مجید کے الفاظ و حروف اور ان کی ترکیب و ترتیب جو یقیناً حادث ہیں ان کو خداوند تعالیٰ کی طرف کس طرح منسوب کر سکتے ہیں حالانکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن مع اپنے الفاظ کے خدا کا کلام ہے۔ جیسا کہ وانزلناہ قرآناً عربیاً اور اسی طرح کی متعدد تصریحات سے خود قرآن مجید سے ثابت ہے اس اعتراض سے بچنے کے لئے ہی متکلمین نے کلام نفسی اور کلام لفظی کا فرق کیا ہے اور انھوں نے کہا ہے کہ "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" جو کہا جاتا ہے تو وہ کلام نفسی کے اعتبار سے کہا جاتا ہے نہ کہ کلامِ لفظی کے لحاظ سے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی تفریق خود قرآن مجید کی نصوص کے خلاف ہے اور اس تفریق سے معتزلہ اور اشاعرہ کا اختلاف بھی محض ایک لفظی اختلاف ہو کر رہ جاتا ہے[1]۔

---

[1] بزرگوں سے سنا ہے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر واقعی قرآن مجید (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

غالباً اس عقدہ کی گرہ کشائی سب سے پہلے حافظ ابن تیمیہ نے کی ہے انھوں نے متعدد مواقع پر لکھا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ حوادث کا قیام ہو سکتا ہے اس مدعا کو ثابت کرنے کے لئے امام عالی مقام کے نزدیک ترتیب مقدمات یہ ہے۔

(۱) قرآن مجید سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا۔

(۲) یہ کلام اور مخاطبت ازل میں نہیں تھی بلکہ حادث تھی۔

(۳) کلام کے لئے ضروری ہے کہ متکلم کے ساتھ قائم ہو۔

ان مقدمات کی ترتیب سے یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ ذاتِ باری کے ساتھ حوادث کا قیام ہو سکتا ہے حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں" ہمارا یہ قول ایک ایسا قول ہے جس کی صحت پر شرع اور عقل دونوں دلالت کرتے ہیں اور جو شخص یہ نہیں کہتا کہ خدا کلام کرتا ہے ارادہ کرتا ہے محبوب اور مبغوض رکھتا ہے راضی ہوتا ہے لاتا ہے اور آتا ہے تو وہ اللہ کی کتاب سے مناقضہ کرتا ہے اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو ندا ازل میں دی تھی اور وہ برابر ندا دیتا رہا تو وہ عقل کی بات سے سرکشی کرنے کے ساتھ ساتھ کلام اللہ کی بھی مخالفت کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ — پس جب موسیٰ وہاں آئے تو انکو ندا دی گئی

(دیکھئے اس میں ندا حضرت موسیٰ کی آمد سے موقت ہے) اور ارشاد ہے۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ — اللہ کا حکم یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہیں کلام نفسی اور کلام لفظی کی تفریق ہوتی تو پھر امام احمد بن حنبلؒ کو کیا ضرورت تھی کہ وہ کوڑے کھاتے اور مصیبتیں اٹھاتے وہ کہہ سکتے تھے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ کلام نفسی کے اعتبار سے ہے ورنہ کلام لفظی تو حادث ہے ہی جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں۔

اس آیت میں "اذا" حرف شرط ہے جو استقبال پر دلالت کرتا ہے[1] ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ امور متجددہ بھی اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔

ایک تنبیہ | لیکن اس تقریر سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ حافظ ابن تیمیہ قرآن مجید کے حروف کو مخلوق مانتے ہیں بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیزیں جن کو ہم حوادث سمجھتے ہیں وہ اگرچہ ہمارے اعتبار سے حوادث ہی ہیں لیکن جب ان کے ساتھ خدا کی کسی صفت کا تعلق ہو تو پھر ہمیں یقین کرنا چاہیئے کہ وہ حوادث محض ہمارے اعتبار سے حوادث ہیں جن میں خدا کی کوئی صفت تجلی کر رہی ہے ورنہ درحقیقت وہ حوادث نہیں ہیں اب ذرا شمع کی مذکورہ بالا مثال کو سامنے رکھ کر غور کرو اور دیکھو کہ جب شمع کی روشنی کا عکس کسی رنگین شیشہ پر پڑتا ہے تو شیشہ کی رنگینی کی وجہ سے خود شمع کی روشنی بھی رنگین ہو جاتی ہے تو اگرچہ روشنی کا یہ رنگ شیشہ کے انعکاس کی وجہ سے ہی ہے لیکن ہے در اصل شمع کی ہی روشنی اس لئے جو شمع کا حکم ہوگا وہی اس روشنی کا بھی ہوگا پس اسی طرح کلام کی بحث کو سامنے رکھ کر سمجھیئے کہ قرآن کے وہ عربی الفاظ و حروف جن سے انسانی کلام مرکب ہوتا ہے بے شک وشبہ حادث ہیں لیکن جب یہی الفاظ و حروف خدا کی صفت کا مظہر اور تجلی گاہ بن جاتے ہیں تو اب ہم ان کو اپنے کلام کے الفاظ و حروف پر قیاس کر کے مخلوق نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ نے اسی مضمون میں ایک جگہ پر اس کی تصریح کر دی ہے فرماتے ہیں۔

"لیکن سلف کا قول یہ ہے کہ اللہ ہمیشہ سے متکلم ہے اور وہ جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے اور کلام ایک صفتِ کمال ہے۔ کیونکہ جو شخص کلام کرتا ہے وہ نسبتاً اس سے اکمل ہوتا ہے جو کلام نہیں کرتا اور یہ ظاہر ہے کہ کمال ان صفات کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے جو موصوف کے ساتھ قائم ہوں، امورِ مباینہ عن الموصوف سے کمال کا تحقق نہیں ہوتا۔۔۔۔۔

[1] کتاب مذہب السلف القویم فی تحقیق مسئلۃ الکلام اللہ الکریم مطبوعہ المنار مصر ص ۱۱۸ و ۱۱۹

پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے صفاتِ کمال کے ساتھ موصوف رہا ہے
اور چونکہ اہم صفاتِ کمال میں سے کلام ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کو ماننا پڑے گا کہ وہ
متکلم ازلاً وابداً ہے اور جب چاہتا ہے عربی میں کلام کرتا ہے جیساکہ اس نے قرآن
عربی کے ذریعہ کلام کیا پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ جن الفاظ وحروف کے
ساتھ کلام کرے گا وہ اس کے ساتھ قائم ہوں گے نہ یہ کہ مخلوق ومنفصل ہوں اس بنا پر
وہ حروف جو اللہ کے اسماء حسنیٰ کے اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کے مبانی ہونگے
وہ مخلوق نہیں ہوسکتے کیونکہ اللہ نے ان سے تکلم کیا ہے[1]"

کون نہیں جانتا کہ پانی اسی وقت پانی ہے جب تک کہ وہ دودھ کے ساتھ نہ ملا ہو
لیکن دودھ میں مل جانے کے بعد کوئی اسے پانی نہیں کہتا بلکہ دودھ کہتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ ایک اور موقع پر لکھتے ہیں۔

"اگر مستلزم للحوادث ممکن بنفسہ ہو یعنی وہ مفعول، معلول اور مربوب کہلائے تو ضروری
ہے کہ وہ حادث ہو۔ لیکن اگر وہ واجب بنفسہ ہو تو ضروری نہیں کہ (استلزام للحوادث
کی وجہ سے) وہ خود ممکن ہو جائے یہی قول ائمہ اہل الملل واساطین الفلاسفہ کا ہے
اور یہی قول جمہور اہلِ حدیث کا ہے[2]"

عقیدۃ الطحاوی کے فاضل شارح[3] نے بھی اس مسئلہ پر کافی بحث کی ہے اور قریب قریب

---

[1] کتاب مذہب السلف القویم ص ۴۴، ۴۵ [2] رسالہ صفۃ الکلام ص ۵۳

[3] شرح عقیدہ طحاوی کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے مطبع سلفیہ مصر کا مطبوعہ ہے اس شرح کے فاضل مصنف نے اپنا نام نہیں بتایا لیکن غالب قیاس یہ ہے کہ اس کے مصنف صدرالدین علی بن محمد بن العز الاذرعی الدمشقی الحنفی المتوفی ۷۴۶ھ ہیں جو علامہ ابن کثیر کے شاگرد ہیں اور صاحبِ کشف الظنون کے بیان کے مطابق افاضل علما احناف سے ہیں

وہی لکھا ہے جو حافظ ابن تیمیہ فرما چکے ہیں۔ ذیل میں ہم اس کا اقتباس درج کرتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ صفاتِ کمال، صفاتِ ذات اور صفاتِ فعل دونوں کے ساتھ ہمیشہ سے متصف ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا، کیونکہ خدا کی تمام صفات، صفاتِ کمال ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا نہ ہونا صفتِ نقص ہے اور یہ بھی جائز نہیں ہے کہ اس کے لئے کوئی صفتِ کمال حاصل ہو، درآں حالیکہ وہ پہلے اس کی ضد کے ساتھ متصف رہ چکا ہو۔

اس پر صفاتِ فعل اور صفاتِ اختیاریہ مثلاً خلق زندہ کرنا۔ مارنا قبض اور بسط غضب اور رضا کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اگرچہ ہم کو اس کی کنہ اور حقیقت معلوم نہیں ہے لیکن اصل معلوم ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ امام مالک سے ثم استویٰ علی العرش کی تفسیر پوچھی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ استواء معلوم ہے لیکن کیف مجہول ہے ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ احوال ایک وقت میں نہیں ہوتے اور کسی دوسری وقت میں حادث ہو جاتے ہیں لیکن احوال و افعال کا یہ حدوث ذاتِ خداوندی کے اعتبار سے ممتنع نہیں ہے اور اس پر اس بات کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عدم کے بعد حادث ہو گئے ہیں تم جانتے ہو کہ جو شخص کلام کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور وہ آج تمہارے سامنے کلام کرے تو تم یہ نہیں کہتے کہ حدث لہ الکلام کلام اس کے لئے حادث ہو گیا ہے البتہ ہاں اگر کوئی شخص گونگا ہو، کلام کی بالکل قدرت نہ رکھتا ہو اور وہ کسی دن کلام کرنے لگے تو اسکی نسبت یہ کہا جائے گا کہ حدث لہ الکلام، جو شخص بغیر کسی آفتِ سماوی کے خاموش ہو وہ خموشی کے وقت بھی متکلم بالقوۃ ہے اور اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ جب چاہے کلام کر سکتا ہے پھر جب کلام کرتا ہے تو متکلم بالفعل ہو جاتا ہے۔ پس جس طرح متکلم بالقوۃ بالفعل

کلام نہ کرنے سے یا کوئی کاتب بالقوۃ بالفعل کتابت نہ کرنے سے کسی صفت تکلم اور کتابت کی ضد سے متصف نہیں ہوتا۔ اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ افعالِ اختیاریہ کا اصطلاحی حدوث باری تعالیٰ کے لئے موجب نقص نہیں ہے۔

اس کے بعد عقیدۂ طحاوی کے فاضل شارح لکھتے ہیں:۔

اور علم کلام میں یہ جو کہا جاتا ہے کہ خدا میں حوادث کا حلول نہیں ہو سکتا تو یہ ایک قول مجمل ہے اس کا ذکر نہ کہیں قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر نفی سے مراد یہ ہے کہ خدا کی مقدس ذات میں اس کی محدث مخلوقات میں سے کسی محدث کا نزول اور اس کے لئے کسی وصف متجدد کا حدوث نہیں ہو سکتا تو بے شبہ اس اعتبار سے یہ کہنا۔۔۔ کہ خدا میں حلولِ حوادث ممتنع ہے صحیح ہے لیکن اگر اس قول سے مراد یہ ہے کہ خدا سے صفاتِ اختیاریہ کی نفی کر دی جائے اور یہ کہا جائے کہ خدا اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق فعل نہیں کر سکتا اور نہ وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے کلام کر سکتا ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ اس اعتبار سے یہ کہنا کہ خدا میں حلولِ حوادث نہیں ہو سکتا بالکل غلط اور باطل ہے۔

بڑی مشکل یہ ہے کہ اہل کلام نفی حلولِ حوادث کے الفاظ بہت ہی مبہم طریقہ پر بولتے ہیں راسخ العقیدہ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کہہ کر خداوند تعالیٰ سے ان چیزوں کی نفی کی جارہی ہے جو اس کی ذات منبع الصفات کے شایان نہیں ہیں۔ جب راسخ العقیدہ مسلمان اس کو تسلیم کر لیتا ہے تو پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ نفی حلول حوادث سے مراد تو یہ تھی کہ خدا سے صفاتِ اختیاریہ اور صفاتِ فعل دونوں کی نفی کر دی جائے"۔

(شرح عقیدہ الطحاوی ص ۵۷، ۵۶)

کلام الٰہی | یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے، خدا کی عام صفات کے متعلق تھا ضمناً کلام الٰہی کا بھی تذکرہ آ گیا ہے اب اس پوری تقریر کو سامنے رکھ کر غور کر کیجیے، تو چند نتائج بیّن طور پر پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) خدا تمام صفاتِ کمال کے ساتھ متصف ہے جن میں سے ایک صفتِ کلام بھی ہے۔

(۲) خدا کی صفات دو قسم کی ہیں ایک صفاتِ ذات اور دوسری صفات فعلی یا فاعلی۔

(۳) صفات فعلی کا ظہور حوادث کی شکل میں ہوتا ہے یعنی حوادث ان کا مظہر بنتے ہیں

(۴) لیکن ان حوادث کو ہم اپنے حوادث پر قیاس نہیں کر سکتے بلکہ صفات فعلی کے ساتھ گہرے ربط کی وجہ سے ان کا حال بھی وہی ہوتا ہے جو صفاتِ فعلی کا ہوتا ہے۔

اب ان صفات پر کلام کی صفتِ ربانی کو بھی قیاس کیجیے، تو اس بات کے ثابت ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کہ خدا کی صفتِ کلام بھی دو طرح کی ہے ایک صفت ذات جو ذات خداوندی کے ساتھ قائم ہے۔ اور جس کے اعتبار سے وہ اس وقت بھی متکلم تھا جب کہ اس کے سوا کسی اور چیز کا کہیں وجود نہیں تھا دوسری صفت۔ صفت فعل ہے یہ وہ صفت ہے جس کی وجہ سے خدا کا کلام مختلف زبانوں میں مختلف انبیاء پر نازل ہوتا رہا اور آخر میں عربی زبان میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

قرآن مع الفاظ کے کلام الٰہی ہے | فرقِ باطلہ کو چھوڑ کر بعض علماءِ حق تک نے کہا ہے کہ خدا کی صفت کلام معنیً واحد ہے اور اس میں تعدّد تکثر، تجزی اور تبعض، مدلول (یعنی معنی و مفہوم) کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ دلالت کے اعتبار سے ہے اور یہ عبارتیں مخلوق ہیں لیکن ان کو جو کلام اللہ کہا جاتا ہے وہ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ یہ عبارتیں مدلول پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر اس مفہوم کو عربی زبان میں ادا کیا جائے تو وہ قرآن ہے اور اگر عبرانی زبان میں ادا کیا جائے تو وہ توراۃ ہے پس عبارتیں مختلف ہیں لیکن کلام مختلف نہیں ہے ابن کلاب اور ابو الحسن اشعری وغیرہ کا یہی قول ہے لیکن

ائمۂ سلف صالحین کا فیصلہ اس کے خلاف ہے وہ قرآن مجید کو مع الفاظ و معانی کے غیر مخلوق مانتے ہیں اور اوپر جو تقریر گذر چکی ہے اس کی روشنی میں اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ سلفِ صالحین کے فیصلہ کو صحیح تسلیم کرنے میں کوئی عقلی استحالہ یا استبعاد بالکل نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کلام خدا کی صفتِ ازلی و ابدی ہے اور اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے لیکن یہ بھی بے شبہ درست ہے کہ اس صفت کا ظہور۔ بروز مختلف شکلوں اور صورتوں میں ہوتا رہا ہے اور یہ اشکال و صور کا اختلاف اصل صفت کلام میں نہیں ہوتا بلکہ ان انبیاء کی وجہ سے ہوتا ہے جو مختلف زبانیں رکھتے تھے اور جن پر کلامِ الٰہی کا نزول ہوتا تھا۔ پس اگرچہ یہ اختلافِ اشکال وصور اصل کلام میں نہیں ہے تاہم مخاطبین کے مختلف احوال و مزایا کے باعث اصل صفت جن مختلف مظاہر میں نظر آرہی ہے وہ سب مظاہر بھی خدا کی ہی طرف منسوب ہوں گے۔ اور شدتِ ارتباط کے باعث ان کا حکم بھی وہی ہوگا جو متجلی کا ہے ایک مرتبہ پھر اسی شمع والی مثال کو سامنے رکھکر غور کرو کہ چراغ کی اصل روشنی کی طرح خدا کی صفت کلام بھی مقید اور مطلق ہے لیکن جس طرح اس روشنی کا عکس کسی رنگین شیشہ پر پڑتا ہے تو خود چراغ کی روشنی کا بھی اسی رنگ میں نظر آنا شیشہ کے انعکاس کے باعث ہی ہوتا ہے لیکن پھر بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ شیشہ کی روشنی رنگین ہے بلکہ وہ رنگین روشنی بھی شمع کی ہی کہلاتی ہے ٹھیک اسی طرح یقین کرو کہ کلام الٰہی کی شمع جانفروز بغیر کسی رنگِ تقید و تعین کے اپنی شان اطلاق کے ساتھ ازلاً و ابداً روشن و تابناک ہے لیکن حضرت موسیٰ کے قلب مطہر کا شیشہ اس لوزلم یزل سے منعکس ہوا تو اسی شمع کلام الٰہی کا جلوہ عبرانی شکل میں نظر آیا حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ کے پاک وصاف دلوں کے آئینے اس روشنی سے عکس پذیر ہوئے تو لوگوں کو اس شمع کی روشنی زبور اور انجیل کی صورت میں نظر آئی پھر سب سے آخر میں اس شمع کا لوز عرب کے ایک قلب آئینہ تمثال پر اس کی انبساط

و مقدرت کے مطابق پرتو فگن ہوا تو اس نور کا ظہور عربی زبان میں ہوا اور قرآن مجید کہلایا پھر جس طرح مطلق روشنی اور رنگین روشنی دونوں شمع کی ہیں اور آپ رنگ کو روشنی سے جدا نہیں کر سکتے اسی طرح مطلق کلام اور کلام بزبانِ عربی (قرآن) دونوں خدا کے ہیں اور آپ قرآن کے عربی الفاظ و حروف کو کلام الٰہی سے خارج قرار نہیں دے سکتے۔ فافہم و تدبّر

عجب بات ہے کہ خود قرآنِ مجید نے نورِ الٰہی کو اسی تمثیل سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (النور)	اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال اس طاق کی سی ہے جس میں چراغ ہو اور چراغ ایک شیشہ میں ہو شیشہ ایسا چمکتا ہو کہ گویا وہ روشن ستارہ ہے یہ چراغ ایک مبارک درخت زیتون کے تیل سے روشن کیا گیا ہو اس درخت کی نسبت نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف، تیل ایسا صاف و شفاف ہو کہ وہ آگ کو چھوئے بغیر روشن ہو جائے اللہ نور علیٰ نور ہے وہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی ہدایت کرتا ہے اللہ یہ مثال لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے

حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے معانی اور الفاظ کو لباس اور ملبوس سے تشبیہ دی ہے اور دونوں کو خدا کی طرف منسوب کیا ہے فرماتے ہیں۔

"قرآن کلام خدا است جل سلطانہ کہ بہ لباسِ حرف و صوت در آوردہ بر پیغمبر ما علیہ و علیٰ

آلہ الصلوٰۃ والسلام منزل ساختہ وعباد را بہ آں امر و نہی فرمودہ چنانچہ ما کلامِ نفسی خود را بہ توسط کام و زبان در لباسِ حرف وصوت در آوردہ ظاہر می سازیم ومقاصد خفیہ خود را در عرصۂ ظہور می آریم ہم چنیں حضرت حق سبحانہٗ کلام نفسی خود را بے توسط کام وزبان بہ قدرتِ کاملہ خود لباسِ حرف وصوت عطا فرمودہ بر عباد فرستادہ است و اوامر و نواہی خفیۂ خود را در ضمن حرف وصوت آوردہ بر منصۂ جلوہ دادہ است۔"

جو لوگ قرآن مجید کو صرف معانی کے اعتبار سے وحی مانتے ہیں اور الفاظ کی نسبت خدا کی طرف نہیں کرتے ان کو غور کرنا چاہیئے کہ قرآن مجید کی تصریحات سے قطع نظر یہ ایک بالکل واضح امر ہے کہ قلب میں محض معانی کے انقار کے کوئی معنیٰ ہی نہیں جس طرح معانی کا اظہار بغیر الفاظ کے نہیں ہوتا۔ اسی طرح قلب میں ان کا ظہور اور پھر ان کا تشخص وتعین بھی الفاظ کے بغیر ناممکن ہے چنانچہ ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنی تصنیف "اسلام میں مذہبی خیال کی تعمیر نو" (Reconstruction of Religious thought in Islam) میں لکھتے ہیں

"جدید علم النفس نے حال ہی میں متصوفانہ شعور وکیفیت کی حقیقت کی طرف توجہ کی ہے اس بلا واسطہ شعور وآگہی کے ذریعہ سالک خدا کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح ہم عام چیزوں کو دیکھ کر، یہ شعور واحساس ناقابلِ تجزیہ ہے اور کسی خارجی وجود کے عکسی پر تو کا نتیجہ ہے اس شعور و احساس کی کیفیت کسی دوسرے کے لئے بیان کرنی بھی مشکل ہے۔

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

پیغمبر کا یہ احساس، فہم وادراک کا عنصر بھی رکھتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کا یہ احساس خیال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے احساس کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ الفاظ کا جامہ پہن کر زبانِ نبوت پر جاری ہوتا ہے احساس در اصل ایک خارجی چیز

(outward Pushing) کا قلب پر وارد ہونا اور خیال اس کے اظہار (outward Rohorting) کا ذریعہ ہے غیر لفظی اور گونگا احساس اپنے منشاء کو خیال کی صورت میں ادا کرتا ہے اور خیال الفاظ کا جامہ پہن کر ظاہر ہوتا ہے گویا یہ کہنا محض استعارہ نہیں ہے کہ خیال اور لفظ دونوں بیک وقت رحم احساس سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خیال الفاظ سے معرا نہیں ہوتا۔ اپنی ابتدا اور آفرینش کے لحاظ سے دونوں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ گویا لفظ بھی ملہم ہے۔ مختصر یہ ہے کہ قرآن لفظاً و معناً کلام الٰہی ہے۔

روزمرہ کی زندگی میں دیکھئے آپ کسی اچھے اور بیساختہ شعر کو سن کر کہتے ہیں یہ تو الہامی شعر ہے اب بتائیے کہ کیا اس جملہ سے آپ کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس شعر کے صرف معانی الہامی ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ معانی کتنے ہی عمدہ اور بلند ہوں اگر الفاظ کا جامہ ان پر چسپ نہیں ہے تو آپ کبھی اس شعر کو الہامی کہہ ہی نہیں سکتے۔

کیا کلام کیلئے نطق ضروری ہے بعض نادان پوچھتے ہیں کہ اچھا خدا کلام کرتا ہے تو اس کے لئے نطق بھی ہوگا حالانکہ نطق اعصاب و عضلات کی مخصوص حرکت کا نام ہے اور یہ حرکت ذاتِ بسیط و مجرد کے لئے نہیں ہوسکتی" جواب یہ ہے کہ اول تو اس شبہ کا جواب پہلے ہی گذر چکا ہے یعنی یہ کہ ہم خدا کی کسی صفت کو اپنی صفت پر قیاس نہیں کرسکتے جس طرح ہمارا ایمان ہے کہ خدا دیکھتا ہے اور سنتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس کے دیکھنے اور سننے کی صورت اور حقیقت کیا ہے؟

اسی طرح ہم کو بہ طریقِ اذعان و یقین معلوم ہے کہ خدا کلام کرتا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ اس کلام کی نوعیت کیا ہے؟

علاوہ ازیں اس کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ کلام کے لئے نطق کی ایسی کوئی

ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ کسی کا کلام وہ ہے جس سے اس کے مافی الضمیر کا اظہار ہو اور یہ اظہار جس طرح زبان کے ذریعہ ہوتا ہے ہاتھ کے یا کسی اور عضو کے اشارہ سے اور اس کے علاوہ مختلف طریقوں سے بھی ہوتا ہے فرض کیجئے ایک شاعر اپنی زبان سے ایک حرف نہ کہے اور وہ پوری ایک غزل صفحہ قرطاس پر لکھ کر ہمیں دیدے تو کیا ہم اس غزل کو اس بنا پر شاعر کا کلام نہیں کہیں گے کہ اس نے اس غزل کے الفاظ و حروف کا نطق کیا ہی نہیں ہے۔

کون نہیں جانتا کہ فوجوں میں جھنڈیوں شیشوں اور اشاروں سے گفتگو کی جاتی ہے اور انھیں ذرائع سے خبریں پہونچائی جاتی ہیں۔ اسٹیشنوں پر بازاروں میں اور ٹریفک کے موقعوں پر سبز اور سرخ روشنیوں سے الفاظ و حروف کا کام لیا جاتا ہے انسان جب تک الفاظ و حروف سے آشنا نہیں ہوا تھا وہ گفتگو کے وقت ہاتھ اور آنکھ کے اشاروں سے مافی الضمیر کا اظہار کرتا تھا۔ ظاہر ہے یہ تمام علامات و اشارات معانی پر دلالت کرنے کے باوصف غیر ملفوظ و غیر منطوق ہیں لیکن اگر ان معانی کو کسی دوسرے تک منتقل کیا جائے تو پھر یہ معانی الفاظ و حروف کا جامہ پہن لیں گے تاہم ان کی نسبت اسی شخص کی ہی طرف ہوگی جس نے بولے بغیر کسی علامت کے ذریعہ آپ کو وہ معانی بتلائے ہیں

اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور واضح مثال یہ ہے کہ تار گھر میں آپ نے دیکھا ہوگا تار بابو ایک آلہ جس کو انگریزی میں ڈمی (Dummy) کہتے ہیں اس کے پاس بیٹھ کر انگلیوں کی حرکت سے اس آلہ کو جنبش دیتا ہے اس کی اس جنبش سے کسی دوسرے شہر میں تار وصول کرنے والا بابو محض گر گٹ گر گٹ کی آواز سنتا ہے اور تار کا تمام مضمون معلوم کر لیتا ہے پھر جب وہ اس مضمون کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا ہے تو مسلسل ایک بامعنیٰ عبارت یا جملہ بن جاتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھئے کہ گر گٹ گر گٹ کی آواز کے ذریعہ تار کا مضمون

صحیح صحیح معلوم کر لینا تار وصول کرانے والے (Reciever) بابو کی لیاقت وقابلیت پر منحصر ہوتا ہے. اگر یہ قابل ہے تو وہ مضمون کا ایک ایک حرف ہی وصول نہیں کرتا بلکہ عبارت کا کاما اور ڈیش تک صحیح صحیح وصول کر لیتا ہے پس یہی حال انبیاء اور رسل کا ہے ذات حق میں اور ان میں ایک خاص قسم کا معنوی تعلق ہونے کے باعث ان میں اس بات کی صلاحیت بدرجۂ اتم ہوتی ہے کہ مبداء فیاض کی جانب سے جن معانی ومطالب کا فیضان ایک خاص طریقہ پر ان کے نفوسِ طاہرہ پر ہو وہ انھیں پورے طور پر سمجھ لیں اور چونکہ کسی معنٰی کا دل میں خطور بغیر الفاظ کے نہیں ہوتا اس لئے انبیاء کرام جب ان معانی کو سمجھتے ہیں تو اس حالت میں سمجھتے ہیں کہ وہ معانی والفاظ کے ساتھ متکیف اور ان کے جامہ میں ملبوس ہوتے ہیں. معانی اور الفاظ میں ایسا گہرا تعلق ہے کہ ان میں زمانہ کے اعتبار سے کوئی تقدم وتاخر نہیں ہوتا بلکہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس آن معانی کا القاء ہو رہا ہے. ٹھیک اسی آن میں الفاظ بھی منجانب اللہ نازل ہو رہے ہیں اور ان الفاظ کا ملہم بھی وہی ہے جس نے معانی کا القاء قلب میں کیا ہے اب دیکھئے یہاں الفاظ اور معانی دونوں کلام الٰہی کی صورت میں نبی کے قلب پر نازل ہو رہے ہیں اور پھر پائے نطق درمیان میں نہیں ہے ولاغرابۃ فیہ

زبان حال کی وسعت گویائی

استدلال کے لئے نہیں بلکہ اتماماً للحجۃ جو متفلسف کلام کا بغیر نطق کے تصور بھی نہیں کر سکتے اس موقع پر ان سے یہ دریافت کرنا غالباً بے محل نہیں ہوگا کہ کیا آپ نے کبھی یہ نہیں سنا کہ بعض مرتبہ زبانِ حال سے دل کی بات ایسے بلیغ پیرایہ میں بیان ہو جاتی ہے کہ زبانِ قال سے نہیں ہوتی عربی کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

وللقلب علی القلب دلیلٌ حین یلقاہٗ
وفی الناس من الناس مقائیسٌ واشباہٗ
وفی العین غنی للمرء ان تنطق افواہٗ[۱]

[۱] ترجمہ:- اور دل جب دل سے ملتا ہے تو اس کے لئے ایک دوسرے پر دلالت کرنے والا ہوتا ہے لوگ آپس میں ایک دوسرے کے مماثل اور مشابہ ہوتے ہیں اور آنکھ اس طرح کلام کرتی ہے کہ منہ کو بولنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

ایک اور شاعر نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں کہا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس نے زبان چشم کی گویائی کو وحی سے تعبیر کیا ہے۔

تری عینہا عینی فتعرف وحیہا ... وتعرف عینی ما بہا لوحی یرجع[1]

ایک شاعر آنکھ کے ذریعہ کسی مافی الضمیر کو اپنے مخاطب پر ظاہر کر دینے کو آنکھ کا نطق بتاتا ہے سنئے۔

العین تبدی الذی فی نفس صاحبہا ... مِنَ المحبۃ او بغضٍ اذا کانا

والعین تنطق والافواہ صامتۃ ... حتیٰ تریٰ من ضمیر القلب تبیانا

ترجمہ:- آنکھ خواہ محبت ہو یا بغض بہرحال اس چیز کو ظاہر کر دیتی ہے جو کسی شخص کے دل میں ہوتی ہے اور آنکھ گویا ہوتی ہے درآں حالیکہ منہ خاموش ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ آنکھ دل کی چھپی ہوئی بات کو صاف صاف دیکھ لیتی ہے۔

کتب عقائد کا ایک مشہور عربی شعر ہے جو کلام نفسی کی بحث میں نقل کرتے ہیں

اِنَّ الکلامَ لفی الفوادِ واِنَّمَا ... جُعِلَ اللسانُ علی الفوادِ دلیلاً

ترجمہ:- کلام تو دراصل دل میں ہوتا ہے زبان تو صرف ظاہر کر دینے والی ہے۔

قرآن مجید میں خدا کی صفت کلام کا ذکر یہاں تک جو بحث تھی محض عقلی تھی ضمناً کہیں کہیں مدعا کی تائید و تقویت کے لئے آیتوں کے حوالے آگئے ہیں۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں خدا کی صفت کلام کی نسبت کیا کچھ تصریحات ہیں

---

[1] ترجمہ:- اس محبوبہ کی آنکھ میری آنکھ کو دیکھتی ہے اور اس کی وحی پہچان جاتی ہے پھر محبوبہ کی آنکھ اس وحی کا جواب دیتی ہے تو میری آنکھ اُسے پہچان جاتی ہے ؂

تاکہ آپ انھیں تنقیحاتِ عقلی پر منطبق کر سکیں۔

کلام صفتِ کمال ہے | حضرت موسیٰؑ کے واقعہ میں سامری کے بچھڑے کا جو نقص بتایا گیا ہے اس میں اس کا بھی ذکر ہے کہ وہ کلام نہیں کر سکتا تھا۔ ارشاد ہے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ ۚ أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا

موسیٰ کے بعد ان کی قوم نے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کا دھڑ بنایا جو گائے کی سی آواز نکالتا تھا کیا ان لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ بچھڑہ نہ ان سے کلام کر سکتا ہے اور نہ کسی راستہ کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔

پھر اسی بچھڑے کی نسبت اسی سورۃ میں ارشاد ہے۔

أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا (طٰہٰ)

کیا وہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ بچھڑا نہ ان کی کسی بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ وہ ان کے ضرر و نفع کا مالک ہے۔

سامری بچھڑے کو خدا بتاتا تھا۔ قرآن اس کی تردید کرتا ہے اور بچھڑے کی عدم الوہیت کی دلیل یہ بیان کرتا ہے کہ وہ تو کلام بھی نہیں کر سکتا تھا اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے لئے متکلم ہونا ضروری ہے۔

خدا کلام کرتا ہے | چنانچہ خدا نے متعدد مواقع پر قرآن میں اپنے کلام کرنے کا ذکر کیا ہے حضرت موسیٰ کے واقعہ میں ذکر ہے۔

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ (اعراف)

اور جب موسیٰ ہمارے مقررہ وقت پر حاضری دینے کیلئے آیا اور اس کے رب نے ان سے کلام کیا

پھر حضرت موسیٰ کو جو شرفِ ہم کلامی عطا فرمایا گیا تھا اس کا ذکر اس طرح ہے۔

یٰمُوسٰی اِنِّی اصۡطَفَیۡتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِی وَبِكَلَامِی	اے موسیٰ میں نے تجھ کو اپنی پیغمبری اور ہم کلامی سے لوگوں پر برگزیدگی بخشی۔

کسی کو خیال ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے اللہ نے سچ مچ کلام نہ کیا ہو اور کلّم کی اسناد اللہ کی طرف مجازاً ہو۔ اس شبہ کا ازالہ بھی کر دیا گیا۔ فرماتے ہیں۔

وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوۡسٰی تَکۡلِیۡمًا	اور اللہ نے موسیٰ سے یقیناً کلام کیا ہے۔

زبان عربی کے رمز شناس جانتے ہیں کہ مصدر سے فعل کی تاکید بیان کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ فاعل سے فعل کا صدور ضرور ہوا ہے۔

ان آیتوں کے علاوہ کئی آیتوں میں اہلِ جنت سے کلام کرنے کا اور بے ایمان لوگوں سے کلام نہ کرنے کا بھی تذکرہ ہے مثلاً اہلِ جنت کے باب میں ہے۔

سَلٰمٌ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِیۡمٍ	سلامتی ہو یہ رب رحیم کیطرف سے کہا گیا ہے

بے ایمانوں کے بارہ میں کہا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ بِعَھۡدِ اللّٰہِ وَاَیۡمَانِھِمۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا اُولٰٓئِكَ لَاخَلَاقَ لَھُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ وَلَا یَنۡظُرُ اِلَیۡھِمۡ	جن لوگوں نے اللہ کے وعدہ اور اپنی قسموں کو تھوڑی سی قیمت میں بیچ دیا ہے ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور اللہ نہ ان سے کلام کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا۔

خدا اپنی شان کے مطابق کلام کرتا ہے

صفتِ کلام کے اثبات کے ساتھ ساتھ قرآن کے انداز بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے کلام کی حقیقت وہ نہیں ہے جو ہمارے کلام کی ہے بلکہ اُس کا کلام اس کی شانِ الوہیت کے مطابق ہوگا اگرچہ قرآن نے اس مضمون کی تصریح نہیں کی لیکن اس نے

مختلف چیزوں کیلئے جو کلام کا لفظ بولا ہے اس سے اس مدعا پر روشنی پڑتی ہے قیامت کے دن انسان کے دست و پا اس کے اعمال و افعال پر جو شہادت دیں گے ان کے ذکر میں ہے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ (یٰسٓ)	آج کے دن ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دینگے اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پیر شہادت دینگے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ کلام کریں گے اور پیر شہادت دیں گے لیکن کس طرح اس کی حقیقت نامعلوم ہے اسی طرح کھالوں کے متعلق ارشاد ہے۔

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْآ اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ	اور یہ لوگ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف شہادت کس طرح دی تو وہ کھالیں جواب دینگی کہ ہم کو اس خدا نے گویا کر دیا ہے جس نے ہر چیز کو گویا کیا ہے۔

اب دیکھئے اس آیت میں جلود کے لئے نطق ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ نطق کس طرح کا ہے؟ تو اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کی حقیقت کا علم صرف خدا کو ہی ہے وہ سرگشتہ ظلمت حدوث و امکان انسان جس کا علم وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا کے دائرہ میں محدود ہے، علم کی ان پہنائیوں تک رسائی کا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے بس اس سے سمجھ لو کہ خدا کا کلام اس کی شان کے مطابق ہوگا ہم اس کی حقیقت کس طرح متعین کر سکتے ہیں۔

خدا ندا کرتا ہے | البتہ قرآن سے اتنی بات اور ثابت ہے کہ خدا کے لئے ندا بھی پائی جاتی ہے حضرت موسیٰ ع کے واقعہ میں ہے۔

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ (طٰہٰ)	جب موسیٰ درخت کے پاس آئے تو ان کو ندا دی گئی کہ اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں۔

اس سے بھی واضح تر یہ ہے۔

وَنَادَیْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَیْمَنِ (مریم)	اور ہم نے موسیٰ کو طور کی داہنی جانب سے ندا دی۔

حضرت آدم کے واقعہ میں ہے۔

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَنَادٰهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ	جب آدم اور حوا نے درخت کو چکھا تو ان کا ستر ظاہر ہوگیا اور یہ جنت کے پتوں سے اپنا تن ڈھانکنے لگے اور ان کے رب نے ان کو ندا دی کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور نہیں کہا تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا ہوا دشمن ہے۔

ایک جگہ ہے۔ (اعراف)

وَیَوْمَ یُنَادِیْهِمْ اَیْنَ شُرَكَآءِیَ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ	اور جس دن خدا ان کو ندا دے گا کہ وہ کہاں ہیں جن کو تم میرا شریک سمجھتے تھے۔

یہ اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد آیات ہیں جن میں خدا کے ندا دینے کا ذکر بہ صراحت مذکور ہے اور چونکہ ندا کا تحقق بغیر صوتِ مسموع کے نہیں ہوتا۔ اس لئے ان آیات سے ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے لئے صوت ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کی احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے

قرآن اور نطق ربانی لیکن یہ امر قابلِ غور ہے کہ جہاں تک قرآن مجید یا کسی اور آسمانی کتاب کے نزول کا

تعلق ہے اس سلسلہ میں خدا کی ندا یا صوت کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں ہو بلکہ حضرت جبریل کو قلم کے ساتھ تشبیہ دے کر غالباً اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح قلم کے ذریعہ کاتب کا پیغام مکتوب الیہ تک پہونچ جاتا ہے اور آواز نہیں ہوتی اسی طرح خدا کا پیغام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک بغیر کسی نطق اور صوت کے پہونچا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ [۱]

آپ پڑھیے اور آپ کے رب اکرم نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی ہے اس نے انسان کو وہ چیزیں بتائیں جنھیں وہ نہیں جانتا تھا۔

انسانوں سے کلام الہٰی کی صورتیں اس کے علاوہ کلام الہٰی کے سلسلہ میں قرآن نے بتایا ہے کہ خدا انسانوں سے کتنے مختلف طریقوں سے کلام کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ [۲]

اور کسی بشر کی یہ مجال نہیں ہو کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کے آڑ سے یا یہ کہ وہ کسی قاصد کو بھیجے جو اللہ کے حکم سی جو کچھ وہ چاہی پہونچائے بے شبہ اللہ تعالیٰ ملبند اور حکیم ہو

[۱] عام مفسرین جبریل کے لئے قلم کا استعارہ کرنے میں یہ حکمت بیان کرتے ہیں کہ اللہ اور آنحضرت کے درمیان جبریل کا واسطہ محض قلم کا سا تھا جس طرح کتابت قلم سے ہوتی ہو لیکن اس کو کاتب نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ وحی پہونچتی تھی جبریل سے پہونچتی تھی لیکن ان کی حیثیت قلم سے زیادہ نہیں تھی اور موحی صرف ذات خداوندی تھی اس توجیہہ کے خوب ہونے میں کلام نہیں لیکن ممکن ہو اس میں یہ حکمت بھی ہو کہ قلم کے ذریعہ سے جو پیغام پہونچتا ہو وہ بہ نسبت پیغام زبانی کے عالمگیر اور ہر زمان و مکان میں یکساں کارگر ہوتا ہے۔

[۲] یہ آیت مشکلات قرآن میں سے ہے اشکال یہ ہو کہ اس آیت میں کلام الہٰی کو (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اس آیت میں کلام الٰہی کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ وحی کے ذریعہ سے کلام، پس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مقسم قرار دے کر اس کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں اور اقسام شے چونکہ آپس میں قسیم ہوتے ہیں اس لئے وہ ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے اس بنا پر خدا کا جو کلام بذریعہ ارسال رسل ہوگا اس کو وحی نہیں کہہ سکتے حالانکہ قرآن مجید سب کا سب بواسطۂ رسول (قاصد) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور وہ وحی ہے دوسرا اشکال یہ ہے کہ "اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلاً فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَایَشَاءُ" میں فیوحی کو ارسالِ رسل پر متفرع کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی خود ارسال رسل کی ایک قسم ہے حالانکہ آیت کے پہلے حصہ میں کلام الٰہی کو تین قسموں پر منقسم کر کے وحی کو ارسال رسل کا قسیم بتایا گیا ہے تو اب قسیم شے کا قسم بننا لازم آگیا۔ دہو محال حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے مشکلات القرآن پر اپنی یادداشتوں میں اس آیت کا بھی ذکر کیا ہے اور اس آیت کی تقریر اس طرح کی ہے کہ اشکال خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں "اِلَّا وَحْیًا"، اس سے مراد ہے بطریق وحی یعنی مصدر بیانِ نوع کے لئے ہے اور چونکہ خدا نے اس وحی کی اسناد اپنی طرف کی ہے اور مابعد کی دو قسموں کو اس کا مقابل ٹھیرایا ہے اس لئے اس وحی سے مراد القارفی القلب ہے اور نفث فی الروع (دل میں پھونکنا یا ڈالنا) خواہ یہ بحالت بیداری ہو یا بحالتِ خواب۔ اس مخصوص مراد کی وجہ سے وحی کی یہ قسم اپنے دونوں قسموں سے ممتاز ہو گئی" اومن وراءِ حجاب" اس سے مراد ہے پس حجاب اس طرح کلام کرنا کہ متکلم نظر نہ آئے اور ایک غیبی آواز سنائی دے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ نے سنا یا شب معراج میں آنحضرت کو پیش آیا "اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلاً فَیُوْحِیَ" اس میں ایحاء (وحی کرنے) کی اسناد خدا کی طرف نہیں بلکہ رسول کی طرف ہے۔ اس لئے مراد یہ ہوئی کہ اس صورت میں فرشتہ پیغمبر سے بالمشافہ گفتگو کرتا ہے اس تنقیح سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ ایحاء اول الذکر وحی سے متغائر ہے یعنی ایک وحی بلاواسطہ ہے اور دوسری بواسطہ اور مقابلۃ الشی لنفسہٖ کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

(مشکلات القرآن ص ۲۲۲، ۲۲۳

پردہ کلام اور کلام بذریعہ قاصد ان تینوں قسموں میں سے کسی نہ کسی طریقۂ کلام سے ہر پیغمبر کو شرفِ خطاب عطا فرمایا گیا ہے حضرت موسیٰ کو کلام پس پردہ کے شرف سے نوازا گیا کہ وادی سینا کے ایک درخت سے انھوں نے صوت ربانی سنی۔ باقی رہیں دو صورتیں تو وہ تمام پیغمبروں کے لئے پائی گئی ہیں اور قرآن میں جگہ جگہ ان کا ذکر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تینوں طریق ہائے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا جس کی تفصیل آگے اپنے موقع پر آئے گی۔

ملکۂ نبوت اور وحی

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ خدا اپنے خاص خاص بندوں سے مختلف طریقوں سے خطاب و کلام کرتا ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیا بھی تو آخر ہمارے جیسے انسان ہی ہوتے ہیں پھر اُن میں ایسی کون سی خصوصیت ہے کہ خدا ان سے کلام کرتا ہی اور وہ خدا کے کلام کو سمجھتے بھی ہیں لیکن ان کے علاوہ کوئی اور شخص شرفِ خطاب ایزدی سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے ضروری ہو کہ آپ نبوت کی حقیقت کو تفصیلاً نہیں تو اجمالاً ہی سمجھ لیں امام رازی نے مطالب لعالیہ میں امام غزالی نے معارج القدس میں حافظ ابن تیمیہ نے کتاب النبوات اور دوسری تصنیفات میں شاہ ولی اللہ الدہلوی نے حجۃ البالغہ میں اور مولانا محمد قاسم النانوتوی نے تقریر دلپذیر میں اس عنوان کے ماتحت مستقلاً نہایت جامع اور سیر حاصل بحثیں کیں ہیں۔ ان سب کا اگر خلاصہ بھی نقل کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے۔ ہم ذیل میں اب ان سب تقریروں کو سامنے رکھ کر نبوت کی حقیقت پر ایک اجمالی بحث کرتے ہیں۔ پہلے بطور مقدمہ چند باتوں کا جان لینا ضروری ہے۔

حکمت | (۱) تمام فلاسفہ اس پر متفق ہیں کہ انسان کے انسان کامل ہونے کا دار و مدار اس کے حکمت مآب ہونے پر ہے۔ یہی وہ طغرائے امتیاز ہے جس کے باعث انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے اور یہی وہ شرف و عزت ہے جس کو قرآن مجید میں۔

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا — اور جس کو حکمت دی گئی اسے بہت بڑی خیر دی گئی

فرما کر بیان کیا گیا ہے حکمت کسے کہتے ہیں اصولی اعتبار سے اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہی سب جانتے اور مانتے ہیں کہ انسان میں اصلی قوتیں دو ہیں ایک قوتِ نظری جس سے انسان اشیاء کے حقوق اور اُن کے حسن و قبح کو معلوم کرتا ہی اور دوسری قوتِ عملی جس کے ذریعہ انسان کوئی عمل کرتا ہے ان دونوں قوتوں میں حاکم کون ہی اور محکوم کون یا افضل و مفضول کس کو کہنا چاہیے اس کو رہنے دیجیے کہ ہمارے موضوع بحث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال یہ مسلم ہی کہ حکمت جس کو کہتے ہیں وہ انھیں دو قوتوں کے کمال کا نام ہے کمال سے مراد یہ ہے کہ دونوں قوتیں نہایت صحیح اور تندرست ہوں یعنی اشیاء کے حقائق اور ان کے حسن و قبح کے متعلق قوت نظری کا فیصلہ بالکل واقعہ کے مطابق ہو اس میں کسی فریب یا کج نظری کو کوئی دخل نہ ہو اسی طرح قوت عملی کے کمال کے معنیٰ یہ ہیں کہ کسی فعل و عمل کے اخذ و ترک پر قوتِ عملی کی تحریک اس فعل کے حسن و قبح پر مبنی ہو وہ ہم کو صرف اسی فعل کے کرنے پر برانگیختہ کرے جو حسن ہونے کے باعث حقیقتاً قابل اخذ ہو۔ اسی طرح وہ ان افعال سے بہ شدت روکے جو قبیح ہونیکی وجہ سے لائقِ ترک ہوں۔

مراتب کمال و نقص کا تفاوت (۲) یہ ظاہر ہے کہ تمام انسانوں میں یہ دونوں قوتیں یکساں نہیں ہوتیں بلکہ ضعف اور قوت زیادتی اور نقص کے اعتبار سے ان میں بے شمار مراتب مختلفہ پائے جاتے ہیں انھیں مراتب کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح شکل و صورت اور رنگ و روپ میں کوئی ایک شخص پورے طور پر کسی دوسرے شخص کے برابر یا مثل نہیں ہوتا۔ اسی طرح فضائل اخلاق اور ملکاتِ نفسی میں بھی دو انسان ایک دوسرے کے مماثل و مساوی نہیں ہوتے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مرتبہ کمال و نقص میں ایک ایک درجہ ایسا ضرور نکلے گا کہ پھر اس کے اوپر (مرتبہ کمال میں) یا اس کے نیچے (مرتبہ نقص میں) کوئی اور درجہ نہیں ہوگا۔

استکمال و تکمیل (۳) کسی انسان کی یہ دونوں قوتیں جب مکمل ہوتی ہیں، تو ان کے کمال کا ایک مرتبہ

یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ انسان خود ہی کامل نہیں ہوتا بلکہ اس کی قوتیں اپنے کمال میں کچھ ایسی مقناطیسی جاذبیت اور کشش بھی رکھتی ہیں کہ دوسروں کو متاثر کرتی ہیں اور دوسروں کی قوت نظری اور قوت عملی کو بھی کمال کی طرف مائل و راغب کر دیتی ہیں۔

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد سمجھئے کہ جس کو نبی کہتے ہیں وہ ہی ہوتا ہے جس کی دونوں قوتیں، نظری اور عملی، انتہا درجہ کی کامل ہوتی ہیں اور وہ دوسروں کی ان قوتوں کو بھی کامل کر سکتا ہے۔

فکر و حدس | یہاں تک جو گفتگو تھی وہ نبوت کی عام حقیقت سے متعلق تھی لیکن چونکہ یہاں ہمارا مطمح نظر نبی کی استعدادِ وحی سے بحث کرنا ہے جس کا تعلق قوتِ نظری سے ہے اس لئے ہم یہاں قوت عملیہ کو نظر انداز کر کے قوتِ نظری کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں اس کے بعد یہ امر خود بخود واضح ہو جائے گا کہ صرف پیغمبر ہی کیوں کلام الٰہی سے شرف اندوز ہو سکتا ہے۔

تقریر بالا سے یہ معلوم تو ہو ہی چکا ہے کہ نبی کی قوت نظری تمام انسانوں سے زیادہ کامل اور افضل ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ فکر و ادراک کے اعتبار سے ایک انسان دوسرے انسان سے مختلف و متفاوت ہوتا ہے کوئی غبی ہوتا ہے اور کوئی ذہین پھر غباوت اور ذہانت کے مراتب و مدارج بھی بیشمار ہیں۔ لیکن جانب نقصان و کمال میں دونوں مرتبے ایسے نکلتے ہیں کہ پھر ان کے اوپر یا نیچے کوئی اور مرتبہ نقصان و کمال نہیں پایا جاتا۔ ابن سینا نے اشارات میں لکھا ہے کہ ہم مرتبۂ نقصان میں دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ غباوت و بلادتِ طبع کے ایسے اسفل السافلین درجہ میں ہوتے ہیں کہ معمولی سے معمولی بات بھی آپ ان کو لاکھ مرتبہ سمجھائیں ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جانب نقصان کے انتہائی مرتبہ میں، ایک ایسے شخص کا موجود ہونا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اس کے بالمقابل مرتبہ

کمال میں بھی ایک ایسا شخص ہوگا جو بغیر کسی تعلیم و تعلم کے اپنے نفس کے ادنیٰ التفات سی ان مشکل سے مشکل مسائل حیات کو بآسانی سلجھا سکے گا جو دوسروں کے لئے عقدۂ لاینحل ہوں گے فلاسفہ ایسے شخص کو صاحب قوۂ قدسیہ یا صاحب حدس تمام کہتے ہیں۔

علماء شریعت کی اصطلاح میں جس کو نبی کہتے ہیں اس کی قوتِ فکر و حدس کا اندازہ فلاسفہ کے مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ امام غزالی احیاء العلوم میں عقل کے مراتب متفاوتہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ومن انکر تفاوت الناس فی	اور جو لوگ اس غریزہ (عقل) میں لوگوں کے
ھٰذہ الغریزۃ فکانہ منخلع عن	متفاوت ہونے کا انکار کرتے ہیں انھوں نے
ربقتہ العقل وکیف ینکر تفاوت	گویا عقل کی رسّی اپنی گردن سے نکال پھینکی ہے
الغریزۃ ولولاہ لما اختلف الناس	اور بھلا اس تفاوت فی الغریزۃ کا انکار کس طرح
فی فہم العلوم ولما انقسموا	کیا جا سکتا ہے اگر یہ تفاوت نہ ہوتا تو لوگ
الی بلید لا یفہم بالتفہیم	علوم کے فہم میں مختلف نہ ہوتے اور نہ ان کا انقسام
الا بعد تعب طویل من المعلم	ہوتا ایسے بلید و غبی کی طرف جو تفہیم کے بعد بھی
والی ذکی یفہم بادنیٰ رمز و	نہیں سمجھتا مگر اس وقت جب کہ معلم کو طویل تعب
اشارۃ والی کامل تنبعث من	برداشت کرنا پڑتا ہے اور ایسے ذکی کی طرف
نفسہ حقایق الامور بدون	جو ادنیٰ رمز اور اشارہ سے بات کو سمجھ جاتے ہیں
التعلیم کما قال تعالیٰ یکاد زیتہا	اور ایسے کامل کی طرف جس کے اپنے نفس سے
یضی ولو لم تمسسہ نار نور علیٰ	بغیر تعلم کے حقایق امور پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ
نور و ذالک مثل الانبیاء اذ تنفجر	تعالیٰ فرماتا ہے قریب ہے کہ زیتون کا

لهم فی بواطنهم امور غامضة من غیر تعلم وسماع ویعبّر عن ذالك بالالهام (ج ۱ ص ۸۷)

تیل آگ چھوئے بغیر ہی روشن ہو جائے یہ نور علیٰ نور ہے اور ان کاملوں کی مثال انبیاء کی سی ہے کیونکہ ان کے دلوں میں بغیر تعلم وسماع کے ہی باریک باریک امور واضح ہو جاتے ہیں اور اس کمال کو الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پھر آگے چل کر اس تفاوت فی العقل کو مثال سے اس طرح سمجھاتے ہیں۔

وانقسام الناس الیٰ من تنتبه من نفسه ویفهم والیٰ من لا یفهم الا بتنبیه وتعلیم والیٰ من لاینفعه التعلیم ایضًا ولا التنبیه کانقسام الارض الیٰ مایجتمع فیه الماء فیقوی فیتفجر بنفسه عیونًا والیٰ مایحتاج الیٰ الحفر لیخرج الی القنوات والیٰ مالاینفع فیه الحفر وهو الیابس وذالك لاختلاف جواهر الارض فی صفاتها فکذالك اختلاف النفوس فی غریزة العقل

(ج ۱ ص ۸۷)

اور لوگوں کا منقسم ہونا ایسے لوگوں کی طرف جو خود بخود متنبہ ہو جاتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں اور ان لوگوں کی طرف جو تنبیہ اور تعلیم سے ہی سمجھ سکتے ہیں اور ایسے لوگوں کی طرف جن کو تعلیم نفع بخشتی ہے اور نہ تنبیہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ زمین کئی قسم کی ہوتی ہے بعض زمینیں تو وہ ہوتی ہیں جن میں پانی جمع ہوتا رہتا ہے اور جب زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ خود چشموں کی شکل میں بہہ پڑتا ہے اور بعض زمینیں وہ ہوتی ہیں جنھیں کھودنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ پانی کو نہروں وغیرہ کی طرف منتقل کیا جائے اور بعض زمینیں جو خشک ہوتی ہیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں کھودنا بھی فائدہ نہیں دیتا اور لوگوں کی عقلوں کا مختلف ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ زمین کے اجزاء اپنی صفات میں مختلف ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ امام غزالی نے کتاب المنقذ من الضلال اور احیاء العلوم میں یہ بھی لکھا ہے کہ نبوت ماورائے عقل ایک مقام ادراک و احساس ہے جو انسان کے حواس ظاہرہ اور قوائے باطنہ کے تدریجی ارتقاء کے بعد حاصل ہوتا ہے لیکن جس طرح تمیز و عقل کے مدرکات کے لئے حواس بیکار ہیں اسی طرح اس درجہ کے مدرکات کے لئے عقل بے کار ہے اگر کوئی شخص اس درجہ کا منکر ہے تو اس کا یہ انکار ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی بے عقل کا عقلی امور سے انکار کرنا۔ المنقذ من الضلال میں فرماتے ہیں۔

بل الایمان بالنبوۃ ان یقر باثبات طور وراء العقل تنفتح فیہ عین یدرک بھا مدرکات خاصۃ والعقل معزول عنھا کعزل السمع عن ادراک الالوان الخ	بلکہ نبوت پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ یہ اقرار کیا جائے کہ عقل سے بالاتر ایک مقام ہے جس میں آنکھ کھل جاتی ہے اور اس کے ذریعہ سے خاص خاص مدرکات کا ادراک کیا جاتا ہے اور عقل ان مدرکات کے ادراک سے ایسی ہی عاجز ہے جیسے کان رنگوں کے ادراک سے۔

اس بنا پر نبوت کا اصل اذعان و یقین امام صاحب کے نزدیک صرف اس شخص کو ہی ہو سکتا ہے جس کو خود نبوت کا مقام حاصل ہو یا جو نفس قدسی رکھنے کے باعث مابعد الطبیعی حقائق کو معلوم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ چنانچہ اپنی حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وبالجملۃ من لم یرزق منہ شیأً بالذوق فلیس یدرک من حقیقۃ النبوۃ الا الاسم	اور خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس کا ذوق نہیں دیا گیا ہے وہ نبوت کی حقیقت کے سلسلہ میں بجز نام کے اور کسی چیز کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

ے ص ۳۱

فلاسفہ کی تعبیر کے مطابق ان ارباب نفوس قدسیہ کا دل آئینہ کی طرح مجلیٰ اور مزکیٰ ہوتا ہے جس میں عقلِ فعال کی طرف سے جو تمام معقولات اور صور معنویہ کا خزانہ ہے۔ حقایق کا انعکاس ہوتا رہتا ہے اور اس فیضان و تاثر کی وجہ سے وہ بڑی سے بڑی نظری چیزوں کا علم حاصل کر لیتے ہیں جو دوسروں کو بڑی مشق و ممارست کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا اور یہ علم شائبہ تردد و شک سے آلودہ نہ ہونے کے باعث قطعی اور حتمی ہوتا ہے۔

ملکۂ نبوت وہبی ہے کسبی نہیں | آئینہ کی مثال سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ملکۂ نبوت ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ خاص موہبتِ خداوندی ہے جو کسی کسی کو عطا فرمائی جاتی ہے قرآن مجید میں ہے۔

اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہٗ — اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنا پیغمبر کس کو بنائے

آپ دیکھتے ہیں آفتاب جہاں تاب طلوع ہو کر کائناتِ عالم کے ذرہ ذرہ پر جلوہ پاش ہوتا ہے اور اس کی شعاعیں در و دیوار مٹی پتھر گھاس اور کوڑا کرکٹ ہر چیز پر پڑتی ہیں لیکن جب یہی شعاعیں کسی آتشی شیشہ پر پڑتی ہیں تو وہ اس کو جگمگا دیتی ہیں یہاں تک کہ خود اس میں سے شعاعیں چھن چھن کر دوسری چیزوں پر جو اس کے بالمقابل ہوتی ہیں عکس ریز ہونے لگتی ہیں اسی طرح یقین کرو کہ وجودِ ابدی و سرمدی کا خورشیدِ حقیقت اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ روشن ہے اور بلا امتیاز ناو شمار ہر چیز کو اپنی شعاعوں سے مستفیض کر رہا ہے لیکن یہ اپنی اپنی فطری و جبلی استعداد کا فرق ہے کہ ہر چیز اس سے اپنی فطری صلاحیت کے مطابق ہی کسب فیض کر سکتی ہے انبیاء کے نفوسِ قدسیہ اگر اس آفتاب حقیقت کی نورانی شعاعوں کو جذب کر کے خود منور ہوتے ہیں اور دوسروں کو منور کر دیتے ہیں تو اس لئے کہ وہ آتشی شیشہ کی طرح اس کی فطری استعداد رکھتے ہیں اور اگر ہم ان انوار و تجلیات سے براہ راست اکتسابِ نور نہیں کر سکتے تو اس کی وجہ یہ ہے

کہ ہمارے دل اور قوائے مدرکہ اس لوہے کی طرح ہیں جس کو جلا نہ پانے کی وجہ سے آئینہ کا ہمسر ہونے کا حوصلہ نہیں ہو سکتا۔ الغرض

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندامِ ماست ورنہ تشریف تو بر بالائے کس دشوار نیست

شہیدی نے بھی اردو میں اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

عام ہیں ان کے تو الطاف شہیدی سب پر تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

یہی وہ عام فطرتِ انسانی سے مافوق باطنی استعداد ہوتی ہے جس کی وجہ سے انبیاء کے حواس عام انسانی حواس سے بہت زیادہ تیز اور ان کا شعور و ادراک دوسرے لوگوں کے شعور و ادراک سے کہیں زیادہ بلند اور اعلیٰ ہوتا ہے اب وہ خدا سے ہم کلام ہوتا ہے۔ استوانہ حنانہ کے گریہ کی آواز سن سکتا ہے کنکریوں کی تسبیح سے اس کے کان آشنا ہوتے ہیں اور وہ مسافت اور مکان و زمان کی حدود و قیود سے گذر کر اپنی آنکھ اور کان سے وہ سب کچھ دیکھ اور سن سکتا ہے جو دوسرے لوگ تو بر تو حجاباتِ نظر و سمع کی وجہ سے دیکھ اور سن نہیں سکتے۔ حریم اسرار ازل کے محرم راز حضرت مولانا رومی فرماتے ہیں۔

فلسفی منکر شود در فکر و ظن گو برو سر را بران دیوار زن!

نطقِ آب و نطقِ باد و نطقِ گل ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل

فلسفی کو منکرِ حنانہ است از حواسِ انبیا بیگانہ است

ایک اور نظریہ شیخ الاشراق اور بعض دوسرے صوفیا و فلاسفہ اسلام کا ایک نظریہ یہ ہے کہ کائنات ہستی تین عالموں کے مجموعہ کا نام ہے جن کو موالیدِ ثلاثہ کہا جاتا ہے یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات ان ہی سے ہر عالم کی انتہا ایک ایسی نوع پر ہوتی ہے جس میں اپنے جنسی و نوعی خصائص کے ساتھ دوسرے عالم کے بعض خصائص بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً جمادات میں مونگا ایک ایسی چیز ہے

جس میں نباتات کی ایک خاصیت نشو ونما پائی جاتی ہے۔ اب ہم نباتات کو دیکھتے ہیں تو اس میں بھی ایک ترقی یافتہ نوع کھجور کی نظر آتی ہے جس میں حیوانات کی طرح تذکیر و تانیث کا فرق و امتیاز ہوتا ہے اور ان کے مذکر و مؤنث کے پیوند سے جس کو عربی میں تابیر کہتے ہیں کھجوریں پیدا ہوتی ہیں ہندوستان میں ارنڈ خربوزہ یا پپیتا اور آم کی بعض قسموں کے متعلق بھی یہی بیان کیا جاتا ہے پھر حیوانات کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ حیوان کی انتہا ایک ایسی قسم مثلاً بن مانس پر ہوتی ہے جس میں بعض انسانی خصایص پائے جاتے ہیں پس جس طرح خاص خاص جمادات میں نباتات کے اور خاص خاص نباتات میں حیوانات کے خصائص پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح نوع انسان میں بعض انسان ایسے پائے جاتے ہیں جن میں ملکوتی خصائص ہوتے ہیں پھر ان ملکوتی خصائص رکھنے میں بھی فرقِ مراتب ہوتا ہے۔ اب ہم کہتے ہیں کہ وہ انسان جس میں تمام ملکوتی الصفات انسانوں سے بڑھ کر ملکوتی خصایص و صفات پائے جائیں شریعت و مذہب کی اصطلاح میں وہی نبی کہلاتا ہے اس اہم خصوصیت کی وجہ سے نبی کے حواس باطنہ و ظاہرہ اس حواس میں ہی محدود نہیں ہوتے بلکہ ان کے علاوہ اس کو بعض ایسے حواس بھی عطا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اسے عالمِ مجردات کے ساتھ قریبی اتصال ہوتا ہے اس اتصال کے باعث وہ خدا کا کلام سن سکتا اور سمجھ سکتا ہے اور اس کی آنکھیں ایسے جلووں سے روشن ہوتی ہیں جن کی دید کی تاب چشم ظاہر لا نہیں سکتی عارف باللہ مولانا رومی نے بھی مثنوی میں متعدد مواقع پر اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں۔

پنج حسے ہست جز ایں پنج حس | آں چو زرِ سرخ وایں حسہا چو مس
حسِ ابداں قوتِ ظلمت خورد | حسِ جاں از آفتابے می چرد
ہر کہ از حسِ خدا دیدہ آیتے | در برِ حق داشت بہتر طاعتے

گر بدیدے حسِ حیوان شاہ را ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ پس بدیدے گاؤخر اللہ را

گر نبودے حسِّ دیگر مرترا ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ جز حسِّ حیواں زبیرون ہوا

پس بنی آدم مکرم کے بُدے ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ کے بحسِّ مشترک محرم شدے

جو لوگ مادیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور جن کی قوتِ فکر و نظر اس درجہ محدود ہے کہ وہ جسم اور مادہ کی حد بندیوں سے گذر کر روح اور عالمِ مجردات کی باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے ان کو تعجب ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا کسی اور نبی کو بشر ہونے کے باوصف ایسا کونسا مقام پیش ہی جس میں آپ حواسِ ظاہری سی بے تعلق ہو کر عالم الیقین و مشاہدہ کی حقیقتوں کو علیٰ وجہ البصیرت دریافت کرسکیں اور پھر انھیں محفوظ بھی کرلیں لیکن یہ لوگ اگر ذرا وسعتِ نظر سے کام لے کر اپنے احوالِ گرد وپیش کا جائزہ لیں اور زندگی کے بعض نادر اور اہم واقعات کا عمیق نظر سے مشاہدہ کریں تو انھیں اس دنیا میں ہی بعض مثالیں مل جائیں گی جن سے وحی و الہام اور عالم مجردات سے تعلق کی نسبت ان کا استبعاد دور ہوسکتا ہی اور وہ یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ ہمارے حواسِ ظاہرہ و باطنہ کے علاوہ بھی خاص خاص لوگوں میں بعض ایسی خاص قوتیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ وہ بالکل حواس کی طرح اشیاء کو محسوس و معلوم کرسکتے ہیں۔

کم وبیش تین برس پہلے کی بات ہی، پنجاب کا ایک شخص خدا بخش نامی دہلی آیا تھا اور اس نے اپنے ایک عجیب وغریب باطنی کمال کا مظاہرہ نئی دہلی کے ایک مشہور و متمول سکھ کی کوٹھی پر کیا تھا اس مظاہرہ میں دہلی کے چند عمائد کے ساتھ اخبار اسٹیٹسمین کا نمایندہ بھی موجود تھا نمایندہ نے اپنے چشم دید واقعہ کے متعلق جو رپورٹ اخبار میں درج کرائی تھی۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہی۔

خدا بخش کی دونوں آنکھوں پر کپڑے کی ایک بہت موٹی پٹی باندھ دی گئی جس کے بعد کسی چیز کو دیکھنے کا امکان ہی نہ تھا اس کے بعد اس سے ایک ایسے کمرہ سے گزرنے کے لئے کہا گیا

جس میں جا بجا منتشر کرسیاں اور میزیں بغیر کسی ترتیب کے ڈالدی گئی تھیں۔ خدا بخش اسی حالت میں ایک بالکل تندرست بینا انسان کی طرح کرسیوں سے بچتا بچاتا کمرہ سے باہر نکل گیا اس کے بعد خدا بخش کے کہنے پر اس کو اردو اور انگریزی کے بعض اخبارات جن میں اخبار اسٹیٹسمن بھی تھا، پڑھنے کے لئے دیئے گئے اور مختلف جگہوں سے پڑھنے کے لئے کہا گیا شخص موصوف نے انھیں بھی صاف صاف بغیر کسی دقت و دشواری کے اس طرح پڑھ دیا کہ گویا اس کی آنکھوں اور اخبارات کے درمیان کوئی چیز حائل ہی نہیں ہے۔ کمال کا مظاہرہ کرنے کے بعد خدا بخش نے ایک تقریر کی جس میں اس نے بتایا کہ در اصل انسان کے دماغ میں آگے کی جانب بعض ایسے بہت ہی چھوٹے چھوٹے غدود ہیں جن سے اگر مشق و ممارست بہم پہونچائی جائے آنکھوں کا کام لیا جا سکتا ہے یہاں تک کہ اگر آنکھیں بالکل ضائع ہو جائیں اور قوت بینائی باقی نہ رہے تو انسان ان غدودوں کے ذریعہ چیزوں کو دیکھ سکتا اور کتاب وغیرہ پڑھ سکتا ہے۔ تقریر کے آخر میں خدا بخش نے کہا کہ میں نے سالہائے دراز کی مشق کے بعد یہ کمال حاصل کیا ہے۔ لیکن میں اب بھی اس پر قانع نہیں ہوں میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھ کو اس قوت میں ابھی اور اضافہ کرنا ہے"۔

بعض واقعات ایسے بھی نظر سے گذرتے ہیں کہ انتہائی حیرت انگیز ہوتے ہیں آدمی ان کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن کوئی عقلی یا منطقی تعلیل و توجیہ نہیں کر سکتا مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین سانپ کے کاٹے کا ایک کامیاب عمل جانتے ہیں جس کا خود میں نے اپنے اکابر و احباب کے ساتھ متعدد بار عینی مشاہدہ کیا ہے۔ اس عمل کیلئے خود مار گزیدہ کا مولانا موصوف کے سامنے موجود ہونا شرط نہیں ہے وہ خواہ کتنے ہی فاصلہ پر ہو کوئی مضائقہ نہیں۔ مولانا کو جو شخص اس واقعہ کی اطلاع دے گا وہ اسے فوراً تھوڑا پانی کچھ

پڑھ کے اور دم کر کے پلائیں گے خدا کی شان ادہر پانی کا گھونٹ اس مخبر کے حلق سے نیچے اتریگا اور ادہر مار گزیدہ سے زہر کا اثر کم ہونے لگے گا یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے بعد بالکل جاتا رہیگا۔

اب ان واقعات پر غور کرو اور بتاؤ کہ وہ لوگ جنھوں نے اپنی آنکھ سے ان کا مشاہدہ کیا ہی کیا وہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو درست ماننے میں تامل کرینگے ہرگز نہیں تو پھر وہ کوئی ان واقعات وحقائق کی منطقی وعقلی توجیہ وتاویل بھی کر سکتے ہیں؟ بالکل نہیں بلکہ دیکھنے والوں کو اس بات کا یقین ہو جاتا ہی کہ بعض بعض انسانوں میں غیر معمولی ذہانت وذکاوت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان سے ایسے عجیب وغریب اور محیر العقول کارنامے سرزد ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر ہم فرط حیرت واستعجاب سے انگشت بدنداں تو ہو سکتے ہیں مگر اس کو سمجھ نہیں سکتے اسی طرح مار گزیدہ کے عمل کو دیکھ کر اس بات کا تو یقین ہو جاتا ہے کہ دواؤں اور جڑی بوٹیوں کی طرح بعض الفاظ وکلمات میں بھی ایسا اثر ہوتا ہی کہ وہ زہر کا اثر اتار دیتے ہیں لیکن یہ کیونکر؟ اور کس طرح؟ اور انھیں الفاظ کی یہ خصوصیت کیوں ہی؟ دوسرے لفظوں میں یہ اثر کیوں نہیں پایا جاتا؟ اور اچھا لفظوں میں تریاقی اثر ہی تو ہوا کرے آخر یہ کیا معاملہ ہے کہ ان الفاظ کا دم کیا ہوا پانی پیتا ہے ایک بالکل غیر متعلق شخص جس نے آکر خبر دی ہے اور اچھا ہو جاتا ہے مار گزیدہ یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا اور انسان کے لئے بجز اس کے کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ اپنی عقل وفہم کی نارسائی کا اقرار کرے اور جو کچھ دیکھ رہا ہے یا جس کو معتبر اور سچے راویوں سے سنا ہے اس کے ہونے کا یقین کرے کتنی ہی عجیب وغریب خبریں ہیں جن کو آپ روزانہ اخباروں اور رسالوں میں پڑھتے ہیں اور ان کو محض اس بنا پہ سچ مان لیتے ہیں کہ کسی معتمد اخبار کے نامہ نگار نے ان کو بیان کیا ہی یا چند امریکہ اور یورپ کے ڈاکٹروں نے ان کا ذاتی طور پر تجربہ کیا ہے۔

نظر کو ذرا وسیع کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ صفات وخصائص کا یہ فرق وامتیاز انسانوں

تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اتحادِ جنسی و نوعی کے باوجود ایک نوع کے مختلف افراد میں بھی بعض انفرادی خصوصیات کے باعث اتنا عظیم الشان فرق پایا جاتا ہے کہ ان پر مختلف الانواع سے تعلق رکھنے کا شبہ ہوتا ہے مٹی اور پتھر اور لعل و یاقوت سب جمادات ہیں مگر ایک تاج سلطانی اور قبائے شاہی کی زینت بنتا ہے اور دوسرا کم ارز ہونے کی وجہ سے انسانوں اور چوپایوں کے قدموں سے ٹھکرایا جاتا ہے پھر لعل اور یاقوت بھی سب ایک طرح کے نہیں ہوتے بعض لعل ایسے ہوتے ہیں کہ بیش بہا بلکہ بے بہا ہونے کے باعث بڑی سے بڑی سلطنت کے خزانہ کے لئے سرمایۂ فخر و ناز ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے لعل گنتی میں دو تین سے زیادہ نہیں ہوتے اور ان کے بالمقابل دوسرے لعل ایسے ہوتے ہیں جن کو صورت و شکل اور رنگ میں یکساں ہونے کے باوجود ہر متمول اور صاحب ثروت انسان کی جیب خرید سکتی ہے۔ خوب اچھی طرح غور کرو، لعل و عقیق اور زمرد و گوہر کیا ہیں؟ پتھر ہی تو ہیں مگر پھر یہ کیا ہے کہ ایک پتھر پتھر ہی رہا دوسرے پتھر کو آفتاب کی شعاعوں نے اپنے مسلسل عملِ تربیت سے لعلِ درخشاں اور یاقوتِ تاباں بنا دیا حالانکہ آفتاب کی شعاعیں دونوں پر یکساں ہی پڑتی ہیں جس کو تم آئینہ کہتے ہو کیا اس کی حقیقت لوہے سے کچھ مختلف ہے! پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ صناع کے دستِ مہارت نے لوہے کے ایک ٹکڑے کو صاف و شفاف روشن آئینہ بنا دیا جو سورج کی شعاعوں کو اپنے سینہ میں جذب کر کے اپنے مقابل کی چیز پر عکس فگن ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس دوسرا لوہا وہی لوہا رہا جو دستِ آہنگر سے آگ کی بھٹی میں جلتا ہے اور پھر سوہان پر ہتھوڑے کی ضرب کھاتا ہے۔ پھول پھول سب برابر ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ ایک پھول اپنی جاں نواز خوشبو سے قلب و دماغ میں عطر کی لہریں دوڑا دیتا ہے اور اس بنا پر کسی کے کاکل عنبر آگیں کی زینت یا کسی کی دستارِ عزت و افتخار کی رونق بنتا ہے اور دوسرے پھول اس سے کم یا بالکل خوشبو نہ رکھنے کے باعث جس ٹہنی پر اپنی آنکھ کھولتے ہیں بالآخر اسی پر بادِ

خزاں کے جھونکے کی تاب نہ لاکر فنا ہو جاتے ہیں یہ سب چیزیں تو خیر پھر بھی جواہر یعنی قائم بالذات ہیں، الفاظ تو اعراض ہی ہیں آپ نے سانپ کے عمل کا حال پڑھ کر اندازہ کر لیا ہوگا کہ خود ان میں بھی حیثیت ملفوظیت میں برابر ہونے کے باوجود کتنا عظیم الشان فرق و امتیاز ہوتا ہے۔

پس جب آپ عالم ہست و بود کی متحد النوع اشیا میں صفات و خصائص انفرادی کے باعث اتنا اختلاف پاتے ہیں تو پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ انسانوں میں ایک انسان اپنے غیر معمولی قوئ باطنیہ یا کسی ایک خاص قوت کی زیادتی کی وجہ سے عام انسانوں کے برخلاف خدا سے شرفِ ہم کلامی حاصل کرے جس طرح سالہائے دراز کے بعد آفتاب کا فیضِ اثر ایک معمولی سے پتھر کو لعل و عقیق کی شکل میں تبدیل کر کے اسے کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے اسی طرح یقین کرو خورشید حقیقت کے انوار و تجلیات جب اپنے مخصوص فیضان و اثر کے لئے کسی خوش نصیب انسان کو چن لیتے ہیں تو پھر وہ دنیا میں نبی بن کر ظاہر ہوتا ہے اور اس سے ایسے معجزے صادر ہوتے ہیں جن کو دوسرے لوگ نہیں کر سکتے اور جس طرح لعل و عقیق روز روز نہیں پیدا ہوتے اسی طرح انبیاء کرام بھی کبھی کبھی مبعوث ہوتے رہے ہیں۔

سالہا باید کہ تا یک سنگِ اصلی ز آفتاب لعل باشد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

اور اب چونکہ ہمارے اعتقاد میں معدنِ ہستی کا وہ "کوہِ نور" ہیرا جو یوم الست سے ذاتِ احدیت کے آفتاب عالم تاب کی آغوشِ مشیت میں تربیت پا رہا تھا اور جس کی آمدِ موعود کے انتظار میں کائنات عالم کا ذرہ ذرہ شب و روز کی ایک ایک ساعت بڑی بے چینی اور اضطراب سے گن رہا تھا اس جہانِ آب و گِل میں جلوہ فروز ہو کر دنیائے اخلاق و انسانیت کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ کو منور کر چکا اس لئے اب آئندہ اس نوع کا کوئی گوہر گراں مایہ (نبی) دنیا میں نہیں آئے گا۔ البتہ ہاں اس سے کم درجہ کے جواہر ہر زمانہ میں موجود رہیں گے اور اس ہیرے کی قائم مقامی کا فرض انجام دیتے رہینگے

نبی کی بشریت | یہاں تک نبی کی اس قوت کا ذکر تھا جس کے ذریعہ وہ خدا کا کلام سن سکتا اور سمجھ سکتا ہے اب ہم نبی کی پیغمبرانہ حیثیت پر ایک دوسرے پہلو سے بحث کرتے ہیں۔

چونکہ نبی اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان خدمتِ سفارت و رسالت انجام دینے کے لئے آتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس میں ملکۂ نبوت اور استعدادِ وحی کے ساتھ بشریت بھی پائی جائے تاکہ وہ ملکۂ نبوت کے ذریعہ خدا کا کلام سنے اور بشر ہونے کی وجہ سے عام انسانوں تک اس پیغام و کلام کو پہونچا سکے اور اپنے عمل و قول سے اس کی تشریح و تفہیم بھی کر سکے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرآن میں ارشاد ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا (انعام) — اور اگر ہم فرشتہ کو پیغمبر بناتے تو اسے بھی آدمی کی ہی شکل میں بھیجتے۔

قاضی بیضاوی نے اس مسئلہ کی توضیح ایک نہایت عمدہ مثال سے کی ہے۔ آیت "وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں

الا ترى ان الانبياء لما فاقت	کیا تم نہیں دیکھتے کہ چونکہ انبیاء کی قوت فائق
قوتهم واشتعلت قريحتهم	اور ان کی طبیعت اس درجہ روشن ہوتی ہے کہ
بحيث يكاد زيتها يضيء ولو لم	گویا زیتون کا تیل آگ چھوئے بغیر خود بخود روشن
تمسسه نار ارسل اليهم	ہے اس لئے خدا ان کے پاس فرشتے بھیجتا ہے
الملائكة ومن منهم على	اور جو زیادہ اونچے مرتبے والے ہوتے ہیں ان
رتبة كلمه بلا واسطة كما	سے بیواسطہ کلام کرتا ہے جیسا کہ حضرتِ موسیٰ
كلم موسى عليه السلام في الميقات	سے میقات میں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے
ومحمدا صلى الله عليه وسلم	شب معراج میں کیا، طبیعات میں اس کی نظیر

ليلة المعراج ونظير ذالك في	یہ ہے کہ چونکہ تباعد کی وجہ سے ہڈی گوشت
الطبيعة ان العظم لما عجز عن	سے غذا قبول نہیں کر سکتی اس لئے اللہ نے
قبول الغذاء من اللحم لما بينهما	اپنی حکمت سے ان دونوں (گوشت اور ہڈی)
من التباعد جعل البارى	کے درمیان چپنی ہڈی پیدا کر دی
تعالیٰ بحکمته بينهما الغضروف	جو دونوں سے مناسبت رکھتی ہے تاکہ وہ غذا
المناسب لهما لياخذ من هذا	اس سے لے اور اس کو دے
ويعطى ذالك	

غرض یہ ہے کہ انبیاء کرام میں جسمانیت اور روحانیت کا ایسا پاکیزہ امتزاج ہوتا ہے کہ ایک طرف وہ بشر ہوتے ہیں اور دوسری جانب ان کی رسائی حظیرۃ القدس کے اس مقام جلیل وعظیم تک ہوتی ہے جہاں جانے کا حوصلہ جبریل امین کو بھی نہیں ہوتا

اگر یک سرِ موئے برتر پرم! فروغ تجلی بسوزد پرم!

اس بنا پر صرف انبیاء ہی اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان سفارت و رسالت کی خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ عام انسانوں کی طرح فرشتے بھی اس خدمت کو ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

وحی اور محققین یورپ

اہلِ مغرب تمام مذہبی قوموں کی طرح سولھویں صدی تک وحی کے قائل رہے کیونکہ ان کی کتابیں انبیاء کے حالات و واقعات سے پُر تھیں جب سائنس کا دور شروع ہوا اور روحانیت سے ہٹ کر لوگوں کی توجہ مادیات کی طرف زیادہ ہوگئی تو پھر فلسفۂ مغرب نے اعلان کیا کہ وحی کا مسئلہ بھی ان پرانے خرافات میں سے ہے جو جہالت و نادانی اور وہم پرستی کے باعث انسانوں کے قلب و دماغ پر اب تک مسلط رہے ہیں اس فلسفہ نے مابعد الطبیعی حقائق کے انکار میں اس درجہ غلو کیا کہ سرے سے خدا اور روح کا ہی انکار کر دیا اس سلسلہ میں وحی کی نسبت کہا گیا کہ یہ یا تو نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کی اختراع ہے جو انھوں نے لوگوں کی توجہات کو اپنی طرف مائل و راغب کرنے کے لئے اختیار کرلی ہے اور یا کسی قسم کا ہذیان ہے جو بعض اعصاب کے مریضوں کو لاحق ہو جاتا ہے اس بنا پر ان کو بعض چیزوں کی صورتیں متمثل نظر آتی ہیں حالانکہ حقیقت میں ان کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی۔

فلسفۂ یورپ نے وحی اور دوسری مابعد الطبیعی چیزوں کی نسبت اپنے اس نظریہ کا اس زور و شور سے پروپیگنڈا کیا کہ یہ نظریہ فلسفہ کا ایک مستقل عقیدہ بن گیا اور ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو عالم یا تعلیم یافتہ کہلانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نظریہ کا قائل ہونا ضروری ہوگیا۔

لیکن ۱۸۴۶ء میں امریکہ میں وجودِ روح کے آثار و علامات نظر آئے جنھوں نے امریکہ سے گذر کر تمام یورپ کے خیالات میں تموّج پیدا کر دیا اور لوگوں کو ایسے عالم روحانی کے وجود کا اقرار

کرنا پڑا جس میں بڑی بڑی عقلیں اور روشن افکار آباد ہیں تو اب مسائل روحانیہ میں بحث و فکر کا نقطۂ نظر بھی بدل گیا اور وحی کا مسئلہ از سرِ نو زندہ ہو گیا علماء نے اس مسئلہ پر پھر بحث شروع کر دی لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان کی یہ بحث کسی مذہبی جذبہ پر نہیں بلکہ علم تجربی کے قواعد پر قائم تھی اس بنا پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے اگر وہ وحی کے باب میں ان نتائج و افکار تک نہیں پہونچ سکے جو علماء اسلام کے نزدیک مسلم ہیں تاہم علماء مغرب کی تحقیق و تفتیش اور اس کے نتائج و استنباطات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ وحی کو ہذیان محض یا وہم و گمان سمجھتے تھے آخر کار ان کو بھی اسکی واقعیت و صداقت کا اقرار کرنا پڑا ہم صرف یہی فرق دکھانے کے لئے ذیل میں علماء مغرب کے افکار و نظریات مختصراً قلمبند کرتے ہیں ممکن ہے اس سے منکرینِ وحی کو کچھ تنبہ ہو اور وہ اپنے اصرار پر نظر ثانی کرنے کی زحمت گوارا کریں۔

مجالس تحقیق یورپ میں روح اور اس کے اثرات کی تحقیق کی طرف بعض علماء کو توجہ ہوئی اور انھوں نے اپنے نتائج فکر شائع کئے تو تمام فضا میں ایک آگ سی لگ گئی بمقام لندن ۱۸۸۲ء میں ایک کمیٹی بنی جس کا مقصد نفس اور اس کے متعلقات پر بحث کرنا اور ان کی تحقیق و جستجو کرنا تھا اس کمیٹی میں جو علماء و اساتذہ شریک تھے ان میں قابلِ ذکر اور نمایاں تر یہ حضرات تھے۔

(۱) پروفیسر جیک کیمبرج یونیورسٹی	صدر کمیٹی انگلستان کا مشہور عالم طبعیات
(۲) پروفیسر سر اولیفر لودگ	علم طبعیات کا ماہر خصوصی
(۳) سر ولیم کروکس	انگلستان کا مشہور عالم کیمسٹری
(۴) پروفیسر فریڈرک مائرس	کیمبرج یونیورسٹی
(۵) پروفیسر ہڈسن	〃
(۶) پروفیسر ولیم جیمس ہرفورڈ یونیورسٹی امریکہ	

(۷) پروفیسر بلیز لوب — کولمبیا یونیورسٹی

(۸) کامیل فلامریون — فرانس کا ماہر مشہور فلکیات وریاضیات

ان کے علاوہ یورپ کے مشہور علمار گارنے باریٹ اور پوڈمور بھی اس کمیٹی میں شریک تھے یہ کمیٹی تقریباً بتیس سال تک قائم رہی اس مدت میں اس نے ہزاروں روحانی واقعات وحوادث کی تحقیق کی اور نفسِ انسانی اس کے قویٰ اور قوت ادراک سے متعلق بار بار تجربے کئے جو چالیس ضخیم جلدوں میں مدون ومحفوظ ہیں. اس کمیٹی نے اپنے نتائج فکر کی اشاعت کی تو انھوں نے ثابت کیا کہ انسان کے لئے ایک اور شخصیت بھی ہے یعنی ہم اپنی موجودہ زندگی میں زندہ ہیں اور ادراک کرتے ہیں. لیکن ہمارا یہ ادراک ان تمام روحانی قوتوں کی وجہ سے نہیں ہوتا جو ہمارے اندر موجود ہیں بلکہ ان روحانی قوتوں کے کسی ایک جز سے ہوتا ہے جس کا اثر حواس خمسہ کے افعال کے ذریعہ ظاہر ہوتا رہتا ہے لیکن جو زندگی کہ ہم کو یہ حواس بخشتے ہیں اس سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کر ایک اور زندگی ہے جس کی عظمت وجلالت کی کوئی نشانی اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی جب تک کہ ہماری یہ ظاہری شخصیت نیند یا کسی اور ذریعہ سے معطل نہ ہو جائے چنانچہ ہم نے ان لوگوں پر جن کو مقناطیسی نیند کے ذریعہ سلا دیا گیا تھا. تجربہ کر کے دیکھا کہ سونے والے کو روحانی زندگی کی دولتِ فراواں حاصل ہوتی ہے اور وہ اس عالم میں اپنے حواس ظاہری کے علاوہ کسی اور حاسہ کے ذریعہ دیکھتا اور سنتا ہے. بعید چیزوں کی خبریں دیتا ہے. اور اس وقت اس کی قوتِ تعقل وادراک پورے طور پر بیدار ہو کر اپنا کام کرتی رہتی ہے۔

کمیٹی کے نزدیک یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی کہ انسان کی ظاہری شخصیت کے علاوہ ایک اور شخصیت ہے جو پہلی شخصیت سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہے. ان علماء نے یہ بھی معلوم کیا کہ یہی وہ اعلیٰ شخصیت ہے جس کے ذریعہ رحم میں جسم کا تکون ہوتا ہے اور جگر قلب اور معدہ وغیرہ

اعضا جن پر انسان کے ارادہ کو کوئی دسترس حاصل نہیں ہے ان کی حرکت بھی اسی اعلیٰ شخصیت کی وجہ سے ہوتی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ انسان کا انسان ہونا اسی شخصیتِ ظاہرہ پر نہیں جس کا قیام حواس خمسہ ظاہرہ کے ساتھ ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جو جسم کے کثیف پردوں کے درمیان سے عمدہ عمدہ خیالات پیدا کرتی ہے الہامات طیبہ کا تعلق بھی اسی سے ہے اور یہی وہ قوت ہے جو انبیاء کے قلب میں ان چیزوں کا القاء کرتی ہے جن کو اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی کہتے ہیں پھر کبھی یہی وحی متجسم ہو کر نظر آتی ہے تو اس کو اللہ کے فرشتے کہتے ہیں جو آسمان سے نازل ہوتے ہیں۔

لے میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ علماء مغرب وحی کی جو حقیقت بیان کرتے ہیں وہ بعینہ وہ نہیں ہے جو علماء اسلام نے بیان کی ہے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ روح اور وحی والہام کے تصور کو کھلی ہوئی گمراہی اور ان کے اعتقاد کو وہم پرستی کہنے والے یورپ کے علماء محققین بھی عرصہ دراز کے غور وخوض کے بعد کس طرح ان چیزوں کی واقعیت کے قائل ہو گئے اور اگرچہ انھوں نے ان چیزوں کی اصلی حقیقت کے بیان کرنے میں اسلامی نقطۂ نظر سے چند در چند غلطیاں کی ہیں لیکن پھر بھی حیرت کی بات ہے کہ ان علماء نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ بعض علماء اسلام کے بیانات سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے اوپر جو تقریر نقل کی گئی ہے ایک طرف تم اسے پڑھو اور دوسری جانب امام غزالی کی تقریر ذیل پر غور کرو جو انھوں نے وجود کی تین قسمیں وجودِ حسی۔ وجود عقلی اور وجود خیالی بیان کرنے کے بعد آخری قسم وجود خیالی کی تشریح میں کی اور پھر دیکھو کہ امام صاحب کی یہ تقریر اور محققین یورپ کے نتائجِ فکر کس قدر ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں امام صاحب فرماتے ہیں۔

"وجود خیالی یہ ہے کہ زبانِ حال تمثیلی رنگ میں محسوس اور مشاہد بن کر سامنے آئے اور یہ خاص انبیاءؑ اور پیغمبروں کی شان ہے اس کی مثال خواب کی ہے جس طرح خواب میں زبانِ حال پیغمبروں کے علاوہ عام آدمیوں کو بھی تمثیلی رنگ میں نظر آتی ہے اور وہ آوازیں سنتے ہیں مثلاً کوئی خواب دیکھتا ہے کہ اونٹ اس سے باتیں کر رہا ہے یا گھوڑا اس کو خطاب کر رہا ہے یا کوئی مردہ اس کو کچھ دے رہا ہے (بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۲ پر)

ان علما محققین کی رائے ہے کہ یہ شخصیت باطنہ حس کے ذریعہ مدرک ہوتی ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ متناطیسی نیند سوتے ہیں ان میں پسندیدہ عقل روشن فکر نظر دور رس نفوس کے پوشیدہ اسرار میں اثر و نفوذ مخفی باتوں کو معلوم کر لینے کی صلاحیت و قابلیت اور اپنی حالتِ ظاہرہ کے اعتبار سے جاہل غبی ہونے کے باعث دنیا کے وسیع اقطار واکناف میں سفر یہ تمام چیزیں اس بات کی سب سے قوی دلیل ہیں کہ انسان کے لئے ایک ایسی (باطنی) شخصیت پائی جاتی ہے جو جسمانی حیات کے پردوں میں مستور رہتی ہے اور وہ اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب کہ اس کا جسم طبیعی یا صناعی نیند میں مصروف ہو۔

پھر رویا صحیحہ بھی جو صبح روشن کی طرح وقوع پذیر ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ انسان غیبی امور کو دریافت کر لیتا ہے یا جس میں وہ بعض اوقات ایسے ایسے مشکل مسائل حل کر لیتا ہے جنھیں وہ بیداری کی حالت میں حل نہیں کر سکتا تھا یا جس میں بعض اوقات وہ ایسے اعمال کر گذرتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱) یا اس کا ہاتھ پکڑ رہا ہے یا اس سے چھینتا ہے یا یہ دیکھے کہ اس کا ناخن شیر ہو گیا ہے یا اسی قسم کی صورتیں جن کو لوگ خواب میں دیکھا کرتے ہیں انبیاء علیہم السلام کو یہ چیزیں بیداری میں نظر آتی ہیں اور اسی بیداری کی حالت میں یہ چیزیں ان سے خطاب کرتی ہیں ایک جاگتا ہوا آدمی جس کو یہ چیزیں نظر آتی ہیں اور محسوس ہوتی ہیں وہ اس بات میں کچھ فرق نہیں کر سکتا کہ یہ خیالی گویائی ہے یا خارجی اور حسی ہے خواب دیکھنے والے کو تو یہ فرق اس لئے محسوس ہو جاتا ہے کہ وہ جاگ اٹھتا ہے اور خواب و بیداری دونوں کی حالتوں میں وہ فرق محسوس کرتا ہے۔ جن لوگوں کو ولایت تامہ حاصل ہوتی ہے ان کو یہ تمثیلی رنگ تنہا نظر نہیں آتا بلکہ اس کا اثر عام حاضرین پر بھی پڑتا ہے اس کی ولایت اپنے فیض کی شعاعیں ان پر ڈالتی ہے اور وہ بھی وہی دیکھتے ہیں جو صاحب ولایت کو نظر آتا ہے اور وہی سنتے ہیں جو صاحب ولایت کو سنائی دیتا ہے۔

(مضمون بہ علی عبداللہ صفحہ ۱۹ مطبوعہ مصر بحوالہ سیرۃ النبی ج ۳ ص ۳۰)

جن کی بحالت بیداری وہ کبھی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کے لئے اس کی ظاہری شخصیت کے علاوہ ایک اور باطنی شخصیت ہے جو پہلی سے کہیں زیادہ بلند اور ترقی یافتہ ہے

ان استدلات کے علاوہ اور بھی متعدد امور ہیں جن کا اس تحقیقاتی انجمن نے نہایت دقیقہ رسی سے عمیق مطالعہ کیا پھر ساتھ ہی ان تجربوں کا جائزہ لیا جو ان سے پہلے کئے جا چکے تھے۔ اور آخر کار انھوں نے عالم روح اور اس کے لطائف و مزایا کا کھلے دل سے اقرار کر لیا۔ اس سلسلہ میں کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور ماہر علم النفس پروفیسر ڈاکٹر مائرس (Myers) نے جو اس انجمن کے بھی رکن خصوصی تھے انسانی شخصیت (Human Personality) پر ایک نہایت قابل قدر کتاب لکھی ہے جس کے متعدد ابواب میں مقناطیسی نیند عبقریت وحی اور شخصیت باطنی پر سیر حاصل بحث کی ہے ہم ذیل میں چند اقتباسات کتاب مذکور کے صفحہ ۷۷ اور اس کے بعد کے صفحات سے نقل کرتے ہیں۔

پروفیسر مائرس نے سب سے پہلے ان ریاضی دانوں کا ذکر کیا ہے جو مشکل سے مشکل مسائل ریاضی کا درست حل فوراً بغیر کسی غور و فکر کے معلوم کر سکتے ہیں پھر لطف یہ ہے کہ اگر ان سے پوچھا جائے کہ تمہیں یہ جواب کیوں کر معلوم ہوا تو وہ بجز اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں معلوم نہیں اس سلسلہ میں پروفیسر موصوف نے بیدلر نامی ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو بڑے سے بڑے عدد کے متعلق یہ بتا سکتا تھا کہ وہ کن اعداد کی ضرب سے حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ اس سے پوچھا گیا کہ وہ کیا کیا اعداد ہیں جن کو ضرب دیا جائے تو ۱۷۸۶۱ کا عدد حاصل ہو جائے تو اس نے غور و تامل کے بغیر فوراً کہا کہ ۳۳۷ کو ۵۳ میں ضرب دیا جائے تو نتیجہ میں یہ عدد پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس سے پوچھا گیا کہ کس قاعدہ اور حساب سے اس نے کہا میں اس سے واقف نہیں گویا اس کا یہ جواب ایک طرح کا طبعی اقتضا تھا جس میں انسان کے ارادہ اور فہم کو دخل نہیں ہوتا۔

مسٹر سکرپٹشر نے مطران واٹلی سے نقل کیا ہے کہ اس نے ایگرتبہ خود اپنی نسبت بیان کیا کہ جب میں پانچ چھ برس کی عمر کا تھا تو میں جمع و تفریق کے سوالات کسی کاغذ پر لکھے بغیر زبانی ہی بہت جلد حل کر دیا کرتا تھا۔ میری یہ حالت تین سال تک رہی مگر تعجب کی بات ہے کہ جب میں بڑا ہوا اور اسکول میں داخل ہو کر باقاعدہ ریاضی کا پڑھنا شروع کر دیا تو میرا یہ خصوصی امتیاز ریاضیات کے ساتھ طبعی مناسبت و فراست تدریجی طور پر کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اب میں ریاضی کا ایک بہت ہی کمزور طالب علم ہوں، اس موقع پر ایک اور واقعہ کا ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا جو مولانا عبدالباری ندوی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

"تریکون متی (Trignometry) یا مساحۃ المثلثات وغیرہ ریاضیات عالیہ کی وہ شاخیں ہیں جن کی کالجوں میں ریاضیات کے اعلیٰ مدارج میں تعلیم دی جاتی ہے، ۱۰، ۱۱ برس کے بچے جو علی العموم زیادہ سے زیادہ سکول کی چوتھی پانچویں جماعت میں پڑھتے ہیں ان کی ریاضی دانی بس حساب کے چند ابتدائی قواعد تک محدود ہوتی ہے، جو لڑکے غیر معمولی طور پر ذہین و محنتی ہوتے ہیں اور جن کی تعلیم کا گھر پر معلم رکھ کر کچھ خاص اہتمام کیا جاتا ہے وہ بہت ترقی کرتے ہیں تو ۱۳-۱۴ برس کی عمر میں اسکول کی تعلیم پوری کر لیتے ہیں۔

لیکن گذشتہ سال اکتوبر میں (۷، اکتا رہ-لیڈر اخبار) راج نرائن نامی ۱۱ برس کے ایک مدراسی لڑکے کا معجزہ ریاضیات (اسی عنوان سے) یہ چھپا تھا کہ اس نے بلا کسی معلم کی مدد کے اعلیٰ الجبرا، تریکون متی، تحلیلی اقلیدس (جومیٹری)، وغیرہ از خود حاصل کی ہے" (سیرۃ النبی ج ۳ ص ۱۳۹)

پروفیسر مائرس نے "الہامی طور پر" ریاضی جاننے والوں کا تذکرہ کرنے کے بعد چند شعرا اور دوسرے لوگوں کا ذکر کیا ہے اور بعض خواب کے عجیب و غریب واقعات بیان کئے ہیں، اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

"میں یقین کرتا ہوں کہ اس قسم کے واقعات دنیا میں پہلی مرتبہ ہی ظاہر نہیں ہوئے بلکہ اس سے پہلے بھی لوگوں کے علم میں آچکے ہیں یہ سب ہمارے شعور باطنی کے کرشمے ہیں جو ہر دور اور ہر زمانہ میں موجود رہتا ہے" پھر آخر میں کہتے ہیں۔

"اب میں پورے وثوق اور جزم واذعان کے ساتھ کہتا ہوں کہ انسان میں ایک روح کا وجود یقینی ہے جو اپنے لئے قوت اور جمال کا اکتساب عالم روحانی سے کرتی ہے اور ساتھ ہی میں اس بات کا بھی یقین رکھتا ہوں کہ تمام عالم میں ایک روح کبیر سرایت کئے ہوئے ہے جس کے ساتھ انسانی روح کو اتصال حاصل ہو سکتا ہے"

اپنی اس تحقیق کے ساتھ ہی مائرس نے فرانس کے مشہور پروفیسر ربیو سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ

"انسان کی باطنی شخصیت ہی وہ چیز ہے جس کو عام لوگ وحی کہتے ہیں، اس حالت کے لئے طبعی صفات وخصائص ہیں جو اس کے ساتھ ہی مختص ہیں، یہ باطنی شخصیت ہر چیز سے مقادم ہے اور یہ نہ کسی شخص کے سامنے جھکتی ہے اور نہ انسانی ارادہ کے تابع ہے جس وقت یہ عمل کرتی ہے تو اس طرح کرتی ہے کہ گویا وہ انسان کی کوئی صفت غریزیہ وفطریہ ہے اس باطنی شخصیت سے مدد طلب کی جاسکتی ہے لیکن اس پر کوئی جبر نہیں کیا جاسکتا[۱]"

علامہ فرید وجدی نے دائرۃ المعارف کی جلد رابع میں لفظ روح کے ماتحت ایک نہایت مبسوط ومفصل اور جامع مقالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے اسپرٹزم (روحانیت) کی تاریخ محققین یورپ وامریکہ کی تحقیقاتی انجمنیں، ان انجمنوں کی رپورٹیں، مشہور محققین کے حبتہ حبتہ اقوال بیان کئے ہیں اور اسی سلسلہ میں انھوں نے سینتالیس علماءِ تحقیق کے ناموں کی ایک منتخب فہرست دی ہے جو روح کے وجود اور اس کے لطائف ومزایا کا حتمی طور پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا مختصر تذکرہ بھی طوالت

[۱] اس حصہ کی اکثر معلومات دائرۃ المعارف فرید وجدی ایک کی جلد ۱۰ لفظ وحی سے ماخوذ ہیں۔

باعث ہوگا۔ اس لئے آخر میں ہم صرف رسل ویلز کی شہادت پر اکتفا کرتے ہیں جو اس نے روح اور اس کے عجائبات کے باب میں قلم بند کی ہے، یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ رسل ویلز طبیعیات میں ڈارون کا ہم پلہ اور اس کا شریک خیال کیا جاتا ہے، اس نے عجائباتِ روح پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ ان الفاظ میں برملا اعتراف کرتا ہے۔

"میں کھلا ہوا دہریہ اور مادہ پرست تھا۔ میرے ذہن میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ میں کسی وقت روحانی زندگی کا اظہار کروں گا یا مادہ اور اس کی قوت کے سوا ایسے وجود کی تصدیق کروں گا جو اس دنیا میں کارفرما ہے مگر میں کیا کروں میں نے پے بہ پے ایسے محسوس مشاہدات کئے جن کو نہیں جھٹلایا جا سکتا تھا۔ انھوں نے مجھ کو مجبور کردیا کہ میں ان چیزوں کو حقیقی اور واقعی تسلیم کروں اگرچہ ایک مدت تک میں یہ تسلیم نہیں کرتا تھا کہ یہ آثار روح سے سرزد ہوتے ہیں، لیکن ان مشاہدات نے رفتہ رفتہ میری عقل کو متاثر کرنا شروع کردیا، نہ بطریقِ استدلال وحجت، بلکہ یہ مشاہدات کے پیہم تواتر کا اثر تھا جس سے میں بجز روح کے اعتراف کے کسی اور طریقہ سے بچ ہی نہیں سکتا تھا۔"

یورپ کے اساتذۂ علوم جدیدہ نے روح کے متعلق جو تحقیقات کی ہیں ان سے وہ ان نتائج پر پہونچے ہیں جو کمیل فلام ریان کے نزدیک حسب ذیل ہیں۔

(۱) روح جسم سے جداگانہ ایک وجودِ مستقل رکھتی ہے۔

(۲) روح میں اس قسم کی خاصیتیں ہیں جو اب تک علوم جدیدہ کی رو سے غیر معلوم تھیں

(۳) روح حواس کی وساطت کے بغیر متاثر ہو سکتی ہے یا دوسری چیز پر اپنا اثر ڈال سکتی ہے

(۴) روح آئندہ واقعات سے واقف ہو سکتی ہے۔

پھر اس روشنی میں وحی کی نسبت ان علماء کا جو خیال ہے وہ یہ ہے کہ وحی در اصل روحِ

انسانی پر ایک خاص قسم کی تجلی کا نام ہے جو اس پر اس کی شخصیت باطنہ کے ذریعہ ضوفگن ہوتی ہے اور اس کو وہ باتیں سکھاتی ہے جنھیں وہ پہلے سے نہیں جانتا تھا اور اس کو ایسے امور کی طرف ہدایت دیتی ہے جن میں خود اس کی بھلائی اور اس کی امت کی ترقی کا راز پنہاں ہوتا ہے[1]۔

وحی کے باب میں علماء اسلام اور ان علماء یورپ میں اتنی بات تو مشترک ہے کہ وحی کا تعلق جسم یا کسی جسمانی طاقت سے نہیں بلکہ روح سے ہے اور یہ انسان کے ارادہ کے تابع نہیں۔ البتہ یہ امر مختلف فیہ ہے کہ اسلام میں وحی فرشتہ کے ذریعہ نبی کے قلب پر اترتی ہے اور ان لوگوں کے نزدیک جس کو فرشتہ کہتے ہیں وہ دراصل انسان کی ہی شخصیت باطنہ ہے جو متشکّل ہو کر اس کے سامنے آجاتی ہے۔ لیکن یہ بھی کیا کم ہے کہ ان لوگوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ ایک روحِ اعظم ہے جو تمام کائنات میں ساری ہے اور انسانوں کی خاص خاص ارواح کو اس کے ساتھ ایک ایسا علاقہ ہوتا ہے جس کے باعث اس سے خارقِ عادات امور صادر ہوتے ہیں اور اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔ پھر یہ علاقہ کی کمی بیشی کا دارومدار انسانی روح کی ذاتی استعداد پر ہے۔

اب ذرا غور کیجیے کہ ان محققینِ یورپ کے الفاظ میں خدا کا اور جبرئیل امین کا کہیں نام نہیں آیا ہے لیکن اگر ذرا تغیر و تبدل کر دیا جائے تو یہ بے تامل کہا جا سکتا ہے۔

عباراتنا شتّٰی وحسنك واحدٌ

---

[1] دائرۃ المعارف ج ۲۰ ص ۷۱۹

تسلسلِ وحی اور نزولِ جبریل

پہلی وحی کے بعد جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، وحی کچھ دنوں کیلئے آنی بند ہوگئی۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "اس میں مصلحت یہ تھی کہ پہلی وحی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دہشت ہوئی تھی وہ جاتی رہے، آپ رفتہ رفتہ اس کو برداشت کرنے کے عادی ہو جائیں اور آپ کو اس کے دوبارہ دیکھنے کا اشتیاق بھی پیدا ہو جائے۔"[۱]

فترتِ وحی یعنی وحی رک جانے کی مدت میں اختلاف ہے۔ حافظ ابن حجر نے تاریخ امام احمد حنبلی سے بروایت شعبی نقل کیا ہے کہ یہ مدت تین برس تھی بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ڈھائی سال تھی لیکن ابن سعد نے حضرت ابن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ "فترت کی مدت چند روز تھی یہی غالباً صحیح ہے۔

آنحضرت صلعم کا حزن و ملال	وحی کے رُک جانے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا رنج و ملال ہوا[۲]

[۱] فتح الباری ج ۱ ص ۲۲ جدید اڈیشن

[۲] بعض روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انقطاعِ وحی کا سخت رنج و قلق ہوا اور ادھر کفار نابکار نے طعن و طنز شروع کر دیا تو اس پر سورۂ والضحیٰ کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ إِذَا سَجٰى مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى	قسم ہے وقت چاشت کی اور قسم ہے رات کی جبکہ وہ ساکن ہوگئی ہو۔ آپ کے رب نے نہ آپ کو چھوڑا ہے اور نہ اس نے دشمنی کی ہے۔

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

صحیح بخاری کتاب التعبیر میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

وَفَتَرَ الوحیُ فترۃً حتیٰ حَزِنَ	اور وحی کا آنا رک گیا یہاں تک کہ آنحضرت
النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم	صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا کہ ہم کو اطلاع ہوئی ہے
فیما بلغنا حزنا غدا منہ مرارًا کی	اس کا غم ہوا۔ آپ کئی مرتبہ گھر سے روانہ ہوئے
یتردیٰ من رؤس شواھقِ	کہ اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹیوں سے گرادیں لیکن
الجبال فکلما اوفیٰ بذروۃ جبل	جب کبھی آپ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے تھے تاکہ
لکے یلقی منہ نفسہٗ تبدیٰ لہٗ	اپنے آپ کو گرادیں تو جبریل ظاہر ہوتے تھے
جبریل فقال یا محمد انَّکَ	اور کہتے تھے اے محمد آپ سچ مچ اللہ کے رسول
رسول اللہ حقًا فیسکن لذٰلک	ہیں یہ سن کر آپ کا قلب سکون پذیر ہو جاتا تھا
جاشہ وتقر نفسہ فیرجع فاذا	اور آپ لوٹ جاتے تھے پھر جب وحی
طالت علیہ فترۃ الوحی غدا لمثل	کی رکاوٹ طویل ہوگئی تو آپ پھر ایسا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لیکن ہماری رائے میں یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ فترۃ الوحی کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر کی آیتیں نازل ہوئی ہیں اب اگر سورۂ والضحیٰ کا نزول سورۂ مدثر کی آیتوں کے بعد مانا جائے تو پھر نزول وحی کے جاری ہونے کے بعد ماودّعک فرما کر کفار کی تردید کرنا شانِ نزول کے ساتھ زیادہ چسپاں نہیں ہوتا اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سورۂ مدثر کے نزول تک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا اعلان ہی نہیں کیا تھا اس لئے وحی کے رک جانے پر کفار کے طعن وطنز کے کوئی معنی نہیں۔ اس بنا پر اس سورۃ کے شان نزول سے متعلق وہی روایت صحیح ہے جس کو امام بخاری نے تفسیر سورۂ والضحیٰ اور باب کیف نزل الوحی میں نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ بیمار تھے چند روز راتوں کو اٹھ کر عبادت الٰہی میں مصروف نہ ہوسکے تو ایک ہمسایہ عورت نے آپ کی شانِ فلک نشان میں سخت گستاخانہ کلمات کہے۔ ان کلمات کی تردید میں یہ سورۃ نازل ہوئی۔

ذالک فاذا اوفی بذروۃ جبل تبدی لہٗ جبریل فقال لہٗ مثل ذالک	کرتے کہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے تھے اس وقت بھی جبریل ظاہر ہوتے اور آپ سے وہی فرماتے تھے

فترت الوحی کے بعد آپ پر جو وحی نازل ہوئی اس کا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں تو تشریف لے جاتے رہتے ہی تھے ایک دن آپ حرا[1] سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ ناگاہ ایک صدائے غیب سنائی دی جو آسمان سے آ رہی تھی آپ نے نگاہ اٹھاکر دیکھا تو وہی فرشتہ تھا جو حرا میں آیا تھا یہ فرشتہ اس وقت آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ کو اس طرح دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور گھر واپس آکر فرمایا "مجھے کمل اڑھا دو" اسی حالت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

یَا اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ[2]	اے گلیم پوش اٹھ اور لوگوں کو ڈرا اور اپنے رب کی کبریائی بیان کر اور اپنے کپڑے پاک رکھ اور ناپاکی کو دور کر

اس کے بعد وحی کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اس کا تار اس وقت تک نہیں ٹوٹا جب تک کہ آپ اس عالم ناپائدار سے روپوش نہیں ہو گئے "فحمی الوحی وتتابع"

حضرت ابن عباس سے ایک روایت ہے کہ آخری آیت قرآن جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے نو یا سات دن پہلے نازل ہوئی سورہ بقرۃ کی یہ آیت ہے۔

وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْہِ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ	اور ڈرو اس دن سے جس میں تم اللہ کی طرف لوٹ جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا

[1] حرا مکہ معظمہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے

[2] صحیح بخاری باب بدء الوحی

حضرت ابن عباس سے ہی ایک دوسری روایت ہے کہ یہ نہیں بلکہ آیت ربا آخری آیت ہے۔ واللہ اعلم (تفسیر خازن ج ۱ مطبوعہ مصر ص ۲۵۵)

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع شروع میں نزولِ وحی کے وقت شدت کا احساس ہوتا تھا اور پھر بربنا بشریت آپ کو وحی کے بھول جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ اس لئے آپ نزولِ وحی کے وقت اپنے لبوں کو جلد جلد حرکت دیتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ	آپ اپنی زبان کو حرکت نہ دیجئے کہ آپ اسکے
اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ	ساتھ عجلت کریں بے شبہ قرآن کا آپ کے
(القیامۃ)	سینہ میں جمع کرنا اور اس کا پڑھانا ہمارا ذمہ ہے

حضرت ابن عباس سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ جب جبریل آتے تھے تو آپ بالکل خاموش ہوکر سنتے تھے، پھر جب جبریل چلے جاتے تو آپ اس وحی کو اسی طرح پڑھتے تھے جس طرح کہ جبریل پڑھ کر سناتے تھے۔ حضرت انس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آخر عمر میں وحی کی کثرت ہوگئی تھی[۱] اس کی وجہ یہ ہے کہ آخر عمر میں مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اطرافِ ملک سے وفود کی آمد کا سلسلہ جاری تھا احکام اور لوگوں کے استفسارات بڑھ گئے تھے

پہلی وحی اس وقت آئی جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سن مبارک چالیس سال تھا جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے اس کے بعد کچھ مدت کے لئے وحی کا آنا رک گیا پھر سلسلہ شروع ہوا تو آخیر عمر تک جاری رہا۔ آپ کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں ہوئی ہے اس بنا پر وحی کی مدت ۲۳ سال ہے۔

جیساکہ بیان ہوچکا ہے شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرشتۂ وحی کے دیکھنے

---

[۱] صحیح بخاری باب کیف نزل الوحی

سے دہشت ہوتی تھی لیکن بعد میں جب آپ ان سے مانوس ہو گئے تو پھر آپ کے شوق و اشتیاق کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر کبھی فرشتۂ وحی کے آنے میں کچھ دنوں کی تاخیر و تعویق ہو جاتی تو آپ مضطرب ہو جاتے تھے

چنانچہ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریلؑ سے فرمایا کہ تم اس سے بھی زیادہ میرے پاس کیوں نہیں آتے؟ اس کے جواب میں حضرت جبریلؑ کی زبانی ارشاد فرمایا گیا۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ج لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا (مریم)	اور ہم تو آپ کے پروردگار کے حکم اور اجازت سے اترتے ہیں اس کو ان تمام چیزوں کا علم ہے جو ہمارے آگے پیچھے اور اس کے درمیان ہیں اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے۔

بارگاہِ نبوی میں حضرت جبریلؑ کی آمد کا کوئی وقت متعین نہیں تھا، صبح شام، دن اور رات جب خدا کا حکم ہوتا وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر خدا کا پیغام پہونچاتے تھے۔ تاہم جس طرح بارش ہونے والی ہوتی ہے تو اس کے آثار و علامات پہلے سے فضا میں محسوس ہونے لگتے ہیں۔ وحی کے نزول یا آمد جبریلؑ کا وقت قریب ہوتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے ہی یہ بات محسوس ہو جاتی تھی اور آپ بے چینی سے اس کا انتظار شروع کر دیتے تھے آپ کی یہ حالت ایسی واضح اور ظاہر ہوتی تھی کہ اگر اس وقت کوئی شخص آپ کے پاس ہوتا تو وہ بھی اس کو محسوس کر لیتا تھا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کا بیان ہے کہ میں ایک شب میں باہر نکلا تو دیکھا کہ سید ولد آدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا چل رہے ہیں اور آپ کے ساتھ کوئی شخص بھی نہیں ہے میں نے خیال کیا کہ غالباً اس وقت آپ کسی کی معیت پسند نہیں کرتے اس لئے میں چاندنی میں چلنے لگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میں نظر آیا۔ آپ نے پوچھا "کون" میں نے عرض کی "ابوذرؓ" میں

آپ پر قربان ہوں ارشاد ہوا اے ابوذر ذرا آؤ تو" میں اس ارشاد گرامی کے مطابق تھوڑی دور چلا تھا کہ زبان نبوت یوں گوہر بار ہوئی" جو ارباب ثروت ہیں وہی قیامت میں کنگال ہوں گے" مگر ہاں وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کو اللہ نے مال دیا اور انھوں نے اس کو دائیں بائیں آگے اور پیچھے بکھیر دیا اور اس میں نیکی کے کام کئے" ابوذر کا بیان ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کچھ دیر تک ہی چلا تھا کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا "تم یہاں بیٹھ جاؤ" یہ فرما کہ آپ نے مجھ کو ایسے میدان میں بٹھا دیا جس کے اردگرد پتھر پڑے ہوئے تھے پھر فرمایا" دیکھنا تم یہاں بیٹھے رہنا یہاں تک کہ میں واپس آؤں" اس کے بعد آپ حرہ[۵۱] کی طرف تشریف لے گئے۔ یہاں تک کہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ آپ دیر تک وہاں ٹھہرے رہے پھر جب آپ آرہے تھے تو میں نے سنا کہ آپ فرما رہے تھے" اگرچہ وہ چوری کرے یا زنا کرے جب آپ آگئے تو مجھ سے صبر نہیں ہو سکا اور میں پوچھ ہی بیٹھا" اے اللہ کے نبی میں آپ پر قربان ہو جاؤں، آپ حرہ کی سمت میں کس سے باتیں کر رہے تھے، میں نے تو کسی کی آواز نہیں سنی کہ وہ آپ کی بات کا کوئی جواب دیتا" ارشاد ہوا" یہ جبریل تھے جو حرہ کے پہلو میں میرے سامنے آئے اور انھوں نے کہا کہ آپ اپنی امت کو خوشخبری سنا دیجئے کہ جس شخص کا انتقال اس حالت میں ہو گیا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا تھا، وہ جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے پوچھا" اگرچہ وہ سرقہ یا زنا کرے" جبریل نے جواب دیا" ہاں اگرچہ وہ سرقہ یا زنا کا مرتکب ہو" میں نے پھر دوبارہ یہی سوال کیا تو جبریل نے پھر یہی جواب دیا[۵۲]

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ آپ نصف شب کو سو رہے تھے کہ اٹھ کر بقیع کے

---

[۵۱] مدینہ منورہ کی شمالی جانب میں ایک مقام کا نام ہے جہاں یزید بن معاویہ کے زمانہ میں مشہور واقعہ قتل و قتال ہوا تھا اور جس میں اہل مدینہ پر لرزہ فگن مظالم کئے گئے تھے۔

[۵۲] صحیح بخاری کتاب الرقاق

قبرستان میں تشریف لے گئے صبح کو آپ نے فرمایا "رات جبرئیل نے مجھ کو پیغام دیا کہ میں اس وقت بقیع میں جا کر دعاء مغفرت کروں[۱]"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ہر ہر ادا اور آپ کا ہر ہر فعل خدا کے حکم اور اس کے ارشاد کے مطابق ہوتا تھا اس بنا پر اگر کبھی آپ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا جو منشا خداوندی کے مطابق نہیں ہوتا تھا تو فوراً جبرئیل امین آکر اس کی اصلاح کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ خندق سے مسلمانوں کی فوج لے کر واپس آئے اور ہتھیار کھول کر غسل فرمایا تو جبرئیل نے آکر کہا "آپ نے ہتھیار کھول دئے حالانکہ ہم اب تک ہتھیار بند ہیں اور بنو قریظہ کو ابھی ان کی غداری کا بدلہ دینا ہے[۲]"

حضرت جبرئیل اگرچہ عموماً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تنہائی میں آتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی اس وقت بھی آتے تھے جب آپ کے پاس مجمع ہوتا تھا یا ایک دو اصحاب بیٹھے ہوتے تھے اس مضمون کی کئی روایات پہلے گذر چکی ہیں، ایک مرتبہ آپ ام المومنین حضرت عائشہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ آپ نے فرمایا "اے عائشہ جبرئیل تم پر سلام بھیجتے ہیں" ام المومنین بولیں "یا رسول اللہ آپ وہ دیکھتے ہیں جو میں نہیں دیکھتی" ایک دفعہ آپ نے غزوہ بدر میں فرمایا "دیکھو یہ جبرئیل اپنے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑے ہیں[۳]"

رمضان میں جبرئیل کی آمد زیادہ ہوتی تھی۔ اس ماہ مبارک میں وہ ہر روز آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید سنتے تھے اور آپ کو سناتے تھے۔

وحی غیر متلو یہ بات یقینی ہے کہ حضرت جبرئیل بعض اوقات خدا کی طرف سے ایسے پیغامات بھی لیکر آتے تھے جو قرآن مجید میں موجود نہیں ہیں، اسی بنا پر علماء اسلام نے وحی کی دو قسمیں کر دی ہیں

---

[۱] نسائی باب الاستغفار للمومنین [۲] بخاری باب غزوۂ خندق [۳] بخاری غزوۂ بدر

ایک متلو اور دوسری غیر متلو، وحی متلو تو وہی ہے جو قرآن مجید کی صورت میں مسلمانوں کے سینوں میں اور سفینوں میں محفوظ ہے۔ دوسری قسم وحی غیر متلو وہ ہے جو احادیث صحیحہ کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے خود قرآن مجید کی تصریح۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ — اور آنحضرت اپنی خواہش سے نہیں بولتے ہیں

اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى (النجم) — بلکہ آپ کا نطق وہ وحی ہوتا ہے جو آپ پر بھیجی جاتی ہے

کے مطابق وہ بھی وحی ہے اور ہمارے لئے سرچشمۂ سعادت و فلاح ہے چونکہ احکام و مسائل کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے تھے وحی سے فرماتے تھے اس بنا پر اگر کوئی شخص آپ سے کوئی حکم دریافت کرتا اور وہ آپ کو معلوم نہ ہوتا تو آپ جواب میں خاموش رہتے اور وحی کا انتظار فرماتے تھے، یعلی بن امیہ کا بیان ہے کہ حجۃ الوداع[1] کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ میں قیام پذیر تھے کہ ایک شخص نے آکر سوال کیا یا رسول اللہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں جس نے کپڑے میں خوشبو مل لینے کے بعد احرام کی نیت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قدر انتظار کیا، یہاں تک کہ آپ پر نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوئی، جب وہ کیفیت زائل ہوگئی تو آپ نے اس سائل کو بلوایا وہ آگیا تو آپ نے فرمایا "جو خوشبو تم مل چکے ہو اس کو تین دفعہ دھو ڈالو اور اس کپڑے کو اتار دو، پھر عمرہ ادا کرو۔

ایک مرتبہ ایک یہودی عالم نے آپ سے پوچھا "بہترین جگہ کون سی ہوتی ہے" آپ خاموش رہے اور پھر فرمایا "میں جبریل کے آنے تک خاموش رہوں گا" چنانچہ جب جبریل آئے تو آپ نے ان سے پوچھا "بہترین جگہ کون سی ہوتی ہے" جبریل نے کہا "اس مسئلہ میں تو سائل اور مسئول منہ یعنی آپ اور میں دونوں برابر ہیں لیکن ہاں میں اپنے رب سے سوال کروں گا پھر جبریل (دوبارہ آئے)

---

[1] یہ روایت اس کتاب میں پہلے بھی ایک جگہ گذر چکی ہے۔

اور انھوں نے کہا " اے محمد! میں اللہ سے اتنا قریب ہو گیا تھا کہ ایسا قریب کبھی نہیں ہوا تھا۔ آنحضرت نے پوچھا " یہ کیوں کر ہوا " وہ بولے " میرے اور خدا کے درمیان نور کے ایک ہزار پردے حائل تھے، اللہ نے فرمایا " بدترین جگہ بازار ہیں اور بہترین جگہ مسجدیں ہیں۔

(صحیح ابن حبان ج ۱ ص ۱۷ مطبوعہ مجتبائی پریس دہلی)

وحی متلو اور غیر متلو دونوں میں حکم کے اعتبار سے فرق یہ ہے کہ وحی متلو یعنی قرآن مجید کا ایک ایک حرف متواتراً منقول ہے اور اس لئے وہ بالکل قطعی اور حتمی طور پر خدا کا کلام ہے لیکن اس کے برعکس وحی غیر متلو یعنی احادیثِ احکام و مسائل کا یہ حال نہیں ہے ان کا بہت کم حصہ متواتر منقول ہے پھر جو متواتراً منقول ہیں، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بھی الفاظ کو خدا کے الفاظ نہیں بتایا اس لئے وہ معنًی تو ارشاد خداوندی ہیں لیکن لفظاً نہیں۔

قرآن مجید وحی الٰہی کیوں ہے؟

گذشتہ مباحث کے بعد آخر میں ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن مجید وحی الٰہی کیوں ہے؟ اس کے کیا دلائل ہیں؟ اور وہ کون سے خصائص و اوصاف ہیں جن کی بنا پر قرآن کلامِ بشر نہیں بلکہ کلامِ الٰہی ہے؟ اس سوال کا ایک واضح اور کھلا جواب تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات جو پیغمبری کے تمام خصائص و محامد کی جامع ہے۔ قرآن کے وحی الٰہی ہونے کی سب سے بڑی اور روشن دلیل ہے۔ گذشتہ ابواب میں ضمنی طور پر اس کی طرف متعدد جگہ اشارات ملیں گے۔ ہم یہاں قرآن کی صرف حیثیتِ کلام کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کرتے ہیں۔

وصفِ اعجاز قرآن کے بیشمار خصائص کے لئے ایک جامع لفظ اعجاز ہی یعنی قرآن مجید اپنے اعجاز کے سبب کلام الٰہی ہی جس طرح کسی جاندار چیز کا پیدا کرنا اور پھر مار ڈالنا۔ آسمان سے پانی کا برسانا اور پھر بادلوں کا کھل جانا۔ مشرق سے آفتاب کا طلوع ہونا اور پھر غروب ہو جانا، ہوا کا چلنا اور تھمنا۔ یہ سب چیزیں انسان کے دسترس اور قابو سے باہر ہیں اور اس لئے یہ سب ایک زبردست قوت کے وجود کی دلیل ہیں جو اپنی قدرت و حکمت سے اس کارگاہِ ہست و بود کو انتہائی نظم و انتظام کے ساتھ چلا رہی ہے اسی طرح قرآن کا معجز نما ہونا یعنی انسانوں کا اس جیسا کلام لانے سے عاجز رہنا اس کے وحی الٰہی ہونے کی بیّن دلیل ہے۔

وجوہِ اعجاز لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کا یہ اعجاز کس وصف کے لحاظ سے ہے؟ علمارِ اسلام نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس سوال کے متعدد جوابات دئے ہیں جن کو مختصراً اس طرح

بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) قرآن مجید کا نظم کلام اور اسلوب ادا معجز ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عرب کے کلام نثر کے لئے جتنے اسالیب مقرر تھے۔ قرآن مجید نے ان سب سے الگ ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے جس کا مثل لانا انسان کے حیطۂ قدرت سے باہر ہے یہ مسلک معتزلہ کی ایک بڑی جماعت کا ہے۔

(۲) اشاعرہ قرآن مجید کا اعجاز فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے مانتے ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا فصیح و بلیغ متکلم بھی قرآن جیسا فصیح و بلیغ کلام نہیں بول سکتا۔

(۳) بعض متکلمین کے نزدیک قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ایک نبی امی کی زبان سے ادا ہوا

(۴) بعضوں کی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید میں گذشتہ اقوام و ملل کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں اور بعض آئندہ واقعات کے بارہ میں جو پیش گوئیاں کی گئی ہیں اور وہ سب حرف بحرف پوری ہوئی ہیں قرآن اُن کے لحاظ سے معجز ہے۔

(۵) بعض علماء کہتے ہیں کہ قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ شروع سے آخر تک ایک ہی اسلوب اور ایک ہی اسٹائل میں ہے۔ اس میں رفع و خفض اور نشیب و فراز بالکل نہیں پایا جاتا۔

(۶) ایک جماعت کہتی ہے کہ اعجاز قرآن کا اصل راز اس کے احکام و تعلیمات میں ہے کہ کوئی انسانی دماغ اس طرح کے معتدل اور پر از حکمت و ہدایت احکام وضع نہیں کر سکتا۔

(۷) کچھ حضرات کی رائے ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز اس کی حیرت انگیز تاثیر ہے جس سے عربی کا ذوق نہ رکھنے والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

(۸) کسی کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ وہ دلوں کے چھپے ہوئے بھید ظاہر کر دیتا تھا جن تک کسی انسان کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی۔[۱]

(۱) حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ پر)

لیکن اصل یہ ہے کہ یہ تمام توجیہات اپنی اپنی جگہ پر قرآن مجید کے حسن تمام وکمال کے کسی ایک رخ کو نمایاں کرتی ہیں ان میں باہمی کوئی تعارض و تضاد نہیں۔ فرض کرو حسن و جمال کا کوئی پیکراتم اگر چند مختلف الذوق لوگوں کے سامنے آجائے تو اس میں سے ہر شخص کس طرح اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کی تشریح و توضیح کرے گا۔ کوئی تناسب اعضاء و جوارح پر فریفتہ ہوگا اور کسی کو رنگ و نزہت پر شیفتگی ہوگی، کوئی قد و قامت کی موزونیت پر دل و جان فدا کرے گا اور کسی کو لب لعلین و کاکل مشکین کا سودا ہوگا کسی کے لئے چشم نرگسی جادوئے بابل کا کام کرے گی اور کوئی جمال آتشیں کی فسوں کاریوں کا ہلاک ستم ہوگا۔ غرض یہ ہے کہ حسن جب کامل اور جمال جب اتم ہوتا ہے تو اس کی ہر ہر ادا اہل نظارہ کو دعوت نظر دید دیتی ہے اور پھر حسن نظارہ سوز کی جلوہ پاشیوں میں نگہ اشتیاق کی لنگ پائی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اسے قدم قدم پر "جا ایں جاست" کا سماں نظر آتا ہے اور وہ وہیں محو حیرت ہو کر رہ جاتی ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم! کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

لیکن جو اہل نظر ہوتے ہیں وہ جان لیتے ہیں کہ اگرچہ تعبیریں مختلف ہیں اور انداز ہائے بیان بھی بدلے ہوئے ہیں لیکن یہ سب رہنمائی کرتی ہیں ایک ہی کی طرف اور یہ سب بیانات ایک حقیقت کلی کی ہی جزئی تشریحات ہیں۔

عبارا تنا شتیٰ وحسنک واحدٌ وکلٌّ الیٰ ذاک الجمال یشیرُ

قرآن مجید نے خود اپنے اعجاز کا دعویٰ کیا ہے اور منکرین کو چیلنج دیا ہے کہ اگر وہ اُسے کلام الٰہی نہیں مانتے تو انھیں چاہیئے کہ اس کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ کا مثل لا کر دکھائیں

(لہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت شاہ ولی اللہ نے الفوز الکبیر باب سوم میں علامہ ابن حزم نے الفصل فی الملل والنحل میں اور علامہ سیوطی نے اتقان میں اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں ان وجوہ اعجاز پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔

اس بنا پر ہم کو ان اختلافات سے قطع نظر کر کے خود قرآن میں تلاش کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے وجوہِ اعجاز میں کیا دلائل پیش کرتا ہے۔ گذشتہ باب "وحی اور قرآن" میں بھی ان دلائل کا اجمالی ذکر آچکا ہے۔ ہم یہاں ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے اس سلسلہ میں پانچ چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت (۲) گذشتہ اقوام کے واقعات اور آئندہ واقعات کے متعلق پیشینگوئیاں (۳) فصاحت و بلاغت (۴) قرآنی احکام و مسائل (۵) قرآن کی غیر معمولی تاثیر۔ ذیل میں انھیں پانچ امور کی تفصیل درج ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ

آپ قرآن سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے اگر ایسا ہوتا تو البتہ یہ باطل پرست شک کر سکتے تھے۔ بلکہ یہ تو کھلی آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جنکو علم بخشا گیا ہے اور ہماری آیات سے ظالم ہی انکار کرتے ہیں

پھر اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے۔

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝
(عنکبوت)

کیا ان لوگوں کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے اس میں ایمان والوں کیلئے رحمت اور نصیحت ہے۔

دیکھو ان آیات میں اللہ تعالیٰ کس طرح قرآن مجید کے وحی الہٰی ہونے اور اسکے منجانب اللہ

نازل ہونے کی نشانی (آیت) یہ بتاتا ہے کہ وہ ایک ایسے نبی امی پہ نازل ہوا ہے جو نہ کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا اور نہ کچھ لکھنا جانتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے کہ آپ کی دعوتِ توحید و اسلام پہ برہم ہو کر کفار مکہ نے کیا کچھ نہیں کہا وہ کونسا افترا اور بہتان تھا جو ان لوگوں نے پیغمبر حق کے برخلاف نہیں باندھا۔ آپ کو (معاذ اللہ) ساحر کہا۔ کاہن کہا سب کچھ کہتے رہے اور ایذا رسانی میں بھی انھوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن یہ کہنے کی جرأت کسی کو نہ ہو سکی کہ آپ امی کہاں ہیں؟ آپ تو نزولِ قرآن سے پہلے بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے عکاظہ اور ذوالمجہند کے سالانہ اجتماعات میں ادھر ادھر کے آتش بیان خطیب اور نامور شعراء جمع ہو کر جوہرِ سخن کی نمائش کرتے اور اس آن بان سے فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان و کلام کی داد دیتے تھے کہ تمام مجمع میں دھوم مچ جاتی تھی۔ لیکن آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے جو عمر مبارک کے چالیسویں سال ہوئی کسی ایک شخص نے بھی نہیں دیکھا اور نہ سنا کہ آپ نے بھی کسی مجمع میں شریک ہو کر کوئی پرزور خطبہ دیا ہو۔ حالانکہ اگر قرآنی فصاحت و بلاغت کا ملکہ آپ کا ایک ذاتی وصف تھا تو اس کا ظہور روز روز نہیں چالیس سال کی عمر سے پہلے کبھی ایک مرتبہ تو ہوا ہوتا یہ ظاہر ہے کہ ہر انسان کے ذاتی جوہر و کمال کے ابھرنے اور نمایاں ہونے کا زمانہ اس کا عہدِ شباب ہوتا ہے چالیس برس کی عمر سے تو قویٰ میں انحطاط کے ساتھ انسان کے ذاتی ملکات اوصاف میں بھی انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ سید کونین عرب میں سب سے زیادہ فصیح تھے چنانچہ آپ نے خود فرمایا ہے "میں تم سب میں فصیح تر ہوں کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنو سعد کی زبان ہے (طبقات ابن سعد ج ۱) لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس غیر معمولی فصاحت و بلاغت کے باوصف آپ نے نبوت ملنے سے پہلے کبھی کہیں ایک مرتبہ بھی کوئی ایسا خطبہ دیا جو قرآن مجید

کے اندازِ بیان اور اسلوب کلام سے ملتا جلتا ہو جس میں قرآن کے بیان کے مطابق حکمت و موعظت اور اسرارِ عالم اور کائنات کے گنجینے بھرے ہوئے ہوں؟ پھر اگر ایسا ہوتا تو آپ کی وہ حیرت و گمشدگی کی حالت کسطرح ہو سکتی تھی جو نزولِ وحی کے بالکل آغاز میں ہوئی اور جسکی طرف قرآن مجید نے

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ — اور خدا نے آپ کو حیرت زدہ پایا اور اُسنے ہدایت کی

کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

پس سوچو اور غور کرو کہ کیا یہ قرآن کا اعجاز نہیں ہے کہ عرب کا ایک گوشہ نشین امی جو نہ لکھنا جانتا ہے اور نہ پڑھنا اور جو نہ علماء کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے اور نہ (ایک دو معمولی سفروں کے علاوہ) کہیں مکہ سے باہر آتا جاتا ہے جو فصاحت و بلاغت اور شعر و خطابت کی عام گرم بازاری کے اور خود اس فضا میں رہنے کے باوجود نہ ایک شعر موزوں کر سکتا ہے اور نہ کوئی خطبہ دیتا ہے۔ لوگ اسے "صادق" "امین" اور "راستباز" کی حیثیت سے جانتے پہچانتے ہیں لیکن حکمت مآب فصیح و بلیغ کی حیثیت سے اسے کوئی شہرت حاصل نہیں ہے وہ عمر کا بہترین حصہ (چالیس سال سے پہلے تک کا) اسی گمنامی میں بسر کر دیتا ہے۔ پھر جب قویٰ میں انحطاط کا زمانہ شروع ہوتا ہے تو یہی امی ایک بالکل عجیب و غریب طریقہ پر دنیا کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ جو لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے عالم کون و فساد کے حقائق سے نقاب الٹ دی۔ حکمت و ہدایت کے دفتر کھول دئے، بڑے بڑے فلاسفہ جن اسرار و رموزِ کائنات کی گرہ کشائی نہیں کر سکتے تھے اس نے چشم زدن میں ان سب کو حل کر کے رکھ دیا پھر اسی خاموش امی کی زبان حق ترجمان سے جو پیغام "قرآن" کے نام سے نکلا اس نے فصاحت و بلاغت کے ایسے ایسے گوہر ہائے گرانمایہ کا انبار لگا دیا کہ بڑے بڑے فصحاء و بلغاء کی زبانیں بار بار کے چیلنج کے باوجود اس کے کسی ایک حصہ کا جواب لانے سے بھی گنگ ہو گئیں اور اس

امی کی زبان کا ایک ایک لفظ شدید ترین ظلمتوں میں بھی حقانیت و صداقت کا آفتاب جہانتاب بن کر چمکا اور اس طرح چمکا کہ

عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

شیخ سعدی کی نعت کے یہ دو شعر پڑھو اور دیکھو کہ اس کا ایک ایک لفظ کس طرح اصل حقیقت کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کرتا ہے۔

کلیمے کہ چرخِ فلک طورِ اوست | ہمہ نورہا پرتوِ نورِ اوست
یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست | کتب خانۂ چند ملت بشست

تو پھر بتاؤ کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت قرآن کے اعجاز کی دلیل نہیں ہے اور کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن آنحضرت صلعم کا نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے؟

واقعات غیب | قرآن مجید کے بیان کے مطابق قرآن کے وحی ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس میں پچھلی قوموں کے ان صحیح صحیح واقعات کا بیان ہے جن کے علم کا کوئی ذریعہ آپ کے پاس موجود نہیں تھا۔ اس طرح کے واقعات کا علم آپ کو تین طریقوں سے ہی ہو سکتا تھا ایک یہ کہ یہ سب واقعات آپ کے سامنے پیش آتے دوسرے یہ کہ آپ نے ان کو کسی کتاب میں پڑھا ہوتا تیسرے یہ کہ آپ کی صحبت ایسے لوگوں کے ساتھ رہی ہوتی جنھیں ان واقعات کا علم تھا اور آپ ان سے ان کا تذکرہ سنتے۔ قرآن مجید ان تینوں ذرائع میں سے ہر ایک کی نفی کرتا ہے پہلے ذریعۂ علم کی نسبت حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں ارشاد ہے۔

وَمَا كُنتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ وَلَٰكِنَّا أَنشَأْنَا قُرُونًا

آپ مغربی جانب میں نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو اپنا حکم بتایا اور نہ آپ وہاں دیکھ رہے تھے لیکن ہم نے کئی جماعتیں پیدا کیں اور ان پر

فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَا أَتَاهُمْ مِنْ نَذِيرٍ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (قصص)

مدت دراز گذر چکی اور نہ آپ مدین والوں میں تھے کہ ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہوتے لیکن ہم رسول بھیجتے رہتے ہیں اور نہ آپ طور کے کنارے تھے جب ہم نے ان کو ندا دی لیکن یہ آپکے رب کا انعام ہے تاکہ آپ ان لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا ہے تاکہ یہ موعظت گیر ہوں۔

حضرت مریمؑ اور حضرت زکریاؑ کے واقعہ میں ہے۔

ذَالِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ

(آلِ عمران)

یہ گذشتہ زمانہ کی خبروں میں ہے جس کو ہم بذریعہ وحی آپ پر نازل کرتے ہیں اور آپ ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنا پانسہ ڈال رہے تھے اور نہ آپ اسوقت موجود تھے جبکہ وہ جھگڑ رہے تھے

حضرت یوسفؑ کے واقعہ میں بھی اسی طرح ارشاد ہے۔

دوسرا ذریعہ علم یہ تھا کہ آپ ان واقعات کو کسی کتاب میں پڑھتے قرآن اس کی بھی نفی کرتا ہے چنانچہ اس سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمیت کے بیان میں جو آیت گذر چکی ہے اس میں اس مضمون کی صاف تصریح ہے اس کے علاوہ ایک اور آیت بھی ہے۔

مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ (شوریٰ)

آپ کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں۔

تیسرا ذریعۂ علم یہ ہو سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان واقعات کو کسی سے سنتے

قرآن مجید اس کی بھی نفی کرتا ہے ۔ ارشاد ہے ۔

تِلْكَ مِنْ اَنْبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا (ہود)

یہ غیب کی باتیں ہیں جو آپ پر ہم بطور وحی نازل کرتے ہیں اس سے پہلے ان باتوں کو نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم جانتی تھی۔

ہر شخص جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے چالیس سال کی زندگی مکہ معظمہ میں گذاری۔ اس تمام مدت میں آپ کا صرف دو مرتبہ شام کے سفر میں جانا ثابت ہے ایک مرتبہ آپ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ گئے تھے۔ اس وقت آپ کا عہدِ طفولیت تھا اور دوسری مرتبہ آپ عہدِ شباب میں تشریف لے گئے تھے لیکن یہ سفر چند روز کے لئے تھا۔ قیام مکّہ کے زمانہ میں آپ قریش والوں میں ہی رہتے سہتے تھے اور یہ لوگ جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے اہل کتاب نہ ہونے کے باعث گذشتہ اقوام وملل کی تاریخ سے بالکل ناآشنا تھے۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ تیسرا ذریعۂ علم بھی سرا سر مفقود تھا۔

ان تینوں ذرائع علم کی نفی کے بعد قرآن کا یہ فرمان کہ "نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ" خود بخود واضح ہو جاتا ہے اور ایک ایسی حقیقت مسلمہ بن کر سامنے آتا ہے کہ کسی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کفار ومشرکین جس طرح آپ کی اُمیت کی تکذیب نہیں کر سکے۔ ان میں سے کسی ایک شخص کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ "آپ یہ کیسے فرماتے ہیں کہ یہ واقعات غیب مجھ کو وحی سے معلوم ہوئے ہیں آپ تو یہ واقعات فلاں شخص سے سنتے تھے یا اس کے پاس آپکی نشست و برخاست تھی" اس قسم کے دعویٰ کا اظہار اگر ہوتا تو علما، یہود ونصاریٰ کیطرف سے ہو سکتا تھا اور حضور کی ٹی زندگی میں انھوں نے بار بار اسکا امتحان بھی لیا لیکن آخر کار انکو بھی قرآن کے وحیِ الٰہی ہونے کا اقرار

کرنا پڑا اور کسی ایک شخص کو بھی آنحضرت کی امیت کا انکار کرنے کا حوصلہ نہیں ہو سکا۔

واقعات آئندہ کی پیشنگوئی | اخبار عن الغیب کے سلسلہ میں قرآن مجید کی وہ پیش گوئیاں بھی داخل ہیں جو بعض نہایت ہی مستبعد امور سے متعلق ہیں اور جو حرف بحرف صحیح ثابت ہو کر رہیں۔

غلبہ روم کی پشین گوئی | ان پشین گوئیوں میں سب سے زیادہ حیرت انگیز اور نمایاں تر پشین گوئی غلبہ روم کی ہے قرآن میں اس کا ذکر اس طرح ہے۔

الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّومُ ۙ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ	الم۔ قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے
وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ	ہیں اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد چند
فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۗ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ	سال میں غالب آجائیں گے اللہ ہی کے
وَمِنْۢ بَعْدُ ۚ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ	ہاتھ ہے سب کام پہلے اور پچھلے اور اس دن
بِنَصْرِ اللّٰهِ ۚ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْ	مسلمان خوش ہوں گے اللہ کی مدد سے اللہ
عَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ وَعْدَ اللّٰهِ ۚ لَا يُخْلِفُ	جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور وہی زبردست
اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ	اور رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کا وعدہ ہو چکا اللہ
لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الروم)	اپنے وعدہ کیخلاف نہ کریگا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے تھے

جنگ روم و ایران کا واقعہ | اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ عرب کے دائیں بائیں روم اور ایران کی دو طاقتور حکومتیں قائم تھیں۔ رومی حکومت عیسائی تھی اور ایرانی سلطنت مجوسی۔ دونوں میں ایک عرصہ سے کش مکش چلی آرہی تھی۔ ایرانی سلطنت کے تخت پر نوشیرواں کا پوتا اور ہرمز کا بیٹا خسرو (Chosres) قابض تھا اور رومی حکومت کی عنان اختیار و اقتدار ہرقل (HERaclius) کے ہاتھ میں تھی۔ ان دونوں حکومتوں میں جنگ و پیکار کا سلسلہ ۶۰۲ء سے ۶۱۶ء تک جاری رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت عیسوی تاریخ کے حساب سے ۵۷۰ء میں ہوئی۔

اور ۶۱۰ء میں آپ کے فرقِ مبارک پر نبوت و رسالت کا تاجِ زرفشاں رکھا گیا۔ دونوں سرحدوں کے قرب کی وجہ سے مکّہ والوں کو طبعی طور پر اس جنگ سے گہری دلچسپی تھی۔ یہاں برابر اس کی خبریں پہونچتی رہتی تھیں۔ ایرانی مجوس یعنی آتش پرست تھے۔ اس لئے مکہ کے کفار و مشرکین کو ان کے ساتھ دلی ہمدردی تھی اور وہ دعائیں کرتے تھے کہ جنگ میں ایرانیوں کو فتح و کامرانی حاصل ہو لیکن مسلمان طبعی طور پر رومیوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ عیسائی ہونے کی وجہ سے ایرانیوں کی نسبت ان سے زیادہ قریب تھے۔

ایرانیوں کی فتح لیکن ایرانی فوج نہایت طاقتور اور منظم تھی اور ادھر رومی فوج کا ایک بہترین جنرل نارسیس قسطنطنیہ کے بازار میں زندہ جلوا دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں نے ایک طرف دجلہ و فرات کے کناروں سے شام کی طرف بڑھنا شروع کیا اور دوسری جانب (ایشیاء کوچک میں) وہ آذربائجان آرمینیہ ہو کر اناطولیہ میں داخل ہو گئے۔ رومی افواج کو دونوں طرف سخت ہزیمت اور پسپائی سے دوچار ہونا پڑا۔

یورپ کے مشہور مورخ گبن کا بیان ہے کہ اس جنگ میں رومیوں کے نوے ہزار آدمی قتل ہوئے۔ کلیساؤں کو آگ لگا دی گئی۔ تین سو برس کی مذہبی نذریں ایک دن میں وقفِ عام ہو گئیں۔ انتہا یہ ہے کہ بیت المقدس سے عیسائیوں کی سب سے زیادہ مقدس صلیب بھی ایران کو منتقل ہو گئی اور قیصر روم ایک جسدِ بیجان ہو کر رہ گیا۔ مشرقی ممالک کے نقصان کے علاوہ یورپ میں بھی ان کی حالت بہتر نہ تھی تمام یورپ میں غدر مچا ہوا تھا۔ اسٹریا (ISTRIA) کی سرحد سے تھریس کی دیواروں تک آوارس (Avars) مظالم ڈھا رہے تھے۔ جنگ اطالیہ میں جن معصوم انسانوں کا خون پانی کی طرح بہا تھا وہ بھی ابھی خشک نہیں ہوا تھا کہ آوارس نے پنونیا (Pannania) کے مقدس میدان میں مرد قیدیوں کو قتل کر دیا عورتیں اور بچے

غلام بنائے گئے رومی سلطنت قسطنطنیہ کی دیواروں، یونان، اٹلی اور افریقہ کے کچھ بقیہ حصوں اور ایشیائی ساحل کے چند بحری مقامات میں صور سے طرازون تک محدود ہو کر رہ گئی۔ غرض یہ ہے کہ ایک طرف عراق، شام، فلسطین، مصر اور ایشیائے کوچک کے وسیع علاقوں میں ایرانی حکومت قائم ہو چکی تھی ہر جگہ آتشکدے تعمیر ہو رہے تھے اور مسیح کے بجائے آگ اور سورج کی جبری پرستش کرائی جا رہی تھی اور دوسری طرف خود رومن امپائر کی وسیع مملکت میں بغاوتیں برپا تھیں اور ان بغاوتوں میں افریقہ اور یورپ کے علاقے بھی شامل تھے ظاہر ہے ان حالات میں سلطنت روم کے بے نام و نشان ہو جانے میں کیا کسر رہ گئی تھی۔[1]

مشرکین مکہ کی مسرت ان ایرانی فتوحات پر مشرکین مکہ جتنے بھی خوش ہوتے کم تھا۔ وہ اس کو مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے لئے فتح کی ایک نیک فال سمجھتے تھے اور مسلمانوں سے برملا کہتے تھے کہ جس طرح ایرانیوں نے رومیوں کو ہزیمت فاش دی ہے اسی طرح اگر کبھی تم میں اور ہم میں لڑائی ہوئی تو ہم کو بھی تم پر فتح حاصل ہوگی۔ مسلمان اس صورت حالات پر نہایت دل گرفتہ اور رنجیدہ تھے مگر کر کیا سکتے تھے۔ راضی بحکم ایزدی تھے کہ ناامیدی اور مایوسی کی شدید ترین ظلمتوں میں غلبہ روم کی آیات نے (جو پہلے گذر چکی ہیں) نازل ہو کر دلوں میں پھر امید و حوصلہ کی روشنی پیدا کر دی۔

کفار مکہ کا استبعاد اور اس کی وجہ کفار مکہ کو اس پیشین گوئی کا علم ہوا تو انھوں نے اس کو نہایت مستبعد سمجھ کر مسلمانوں کا مذاق اڑایا اور کہا کہ اچھا آؤ ہم تم شرط کریں کہ اگر رومی واقعی غالب آ گئے تو ہم

---

[1] گبن نے اپنی کتاب تاریخ زوال روما جلد ۳ میں ایران و روم کی اس جنگ کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے اردو میں علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی جلد ۳ میں اور ہمارے لائق دوست مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایڈیٹر الندوہ نے الندوہ جلد ۲ نمبرہ میں گبن کی تاریخ سے ہی اخذ کر کے اس جنگ کے مفصل حالات لکھے ہیں ہم نے اس بحث میں ان دونوں مضامین سے استفادہ کیا ہے۔

مسلمانوں کو کئی اونٹ دیں گے اور اگر اس کے برعکس ظہور ہوا تو مسلمان اونٹ ہار جائیں گے حضرت ابو بکرؓ نے مسلمانوں کی طرف سے اس پیشین گوئی کے ظہور کی مدت چھ سال مقرر کی تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو ارشاد ہوا کہ "بضع" کا لفظ تین سے نو تک پر بولا جاتا ہے اس بنا پر دس سال سے کم کی مدت مقرر کرنی چاہیئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے اس ارشاد نبوی کے مطابق نو سال کی شرط کی[۱]۔"

حقیقت یہ ہے کہ نظر بر اسباب ظاہری ان حالات میں کسی کو یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ابھی چند برسوں میں ہی پانسہ بالکل پلٹ جائے گا اور شکست خوردہ رومی پھر طاقتور ایرانیوں پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ کیونکہ ایک طرف ایرانی فتوحات اور طاقت و قوت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے رومیوں کے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک چپہ چھین لیا اور دوسری جانب قیصر روم ہرقل کی عیش پسندی اور غفلت مآبی کا یہ حال تھا کہ وہ گبن صاحب کے الفاظ میں پرلے درجے کا سست، کاہل اور اپنی قوم اور ملک کی بربادی کا نام دتماشائی تھا"۔

"تاریخ زوال روما" کا مصنف لکھتا ہے:۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں پیشین گوئی کی کہ چند سال کے اندر اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے۔ جب یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اس وقت اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ کیونکہ ہرقل کی حکومت کے ابتدائی بارہ سال سلطنت روما کی قریبی تباہی اور خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے۔

بہر حال یہ وہ نامساعد و ناموافق حالات تھے جن میں قرآن کی طرف سے غلبۂ روم کی بظاہر بالکل مستبعد پیشینگوئی کا اعلانِ عام کیا گیا۔ ترمذی میں ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کو اس قدر خوشی ہوئی

---

[۱] مستدرک حاکم جلد ۲ تفسیر سورۂ روم و ترمذی باب تفسیر سورہ روم

کہ وہ مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں چیخ چیخ کر "الم غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون" کی تلاوت کرتے پھرتے تھے۔

پیشینگوئی کی صداقت کا ظہور یہ آیت بعثت نبوی کے پانچویں سال نازل ہوئی تھی یعنی عیسوی تاریخ کے لحاظ سے ۶۱۴ء میں جب کہ ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں کی شکست کا آغاز ہو چکا تھا پھر ہوتے ہوتے ۶۱۶ء میں یہ شکست انتہا کو پہونچ گئی۔ آغاز شکست سے پورے آٹھ برس بعد یعنی ۶۲۲ء میں رومیوں کے تن مردہ میں پھر جان پیدا ہوئی اور انھوں نے ایرانیوں کے انتہائی جبر وظلم سے تنگ آ کر ہرقل کی قیادت میں ایرانیوں پر حملہ کر دیا۔ ۶۲۳ء سے انکو قرآن مجید کی پیشین گوئی کے مطابق اس حملہ میں کامیابی ہونی شروع ہوئی اور انجام کار ۶۲۵ء میں رومیوں کی فتح اس شان سے پایۂ تکمیل کو پہونچی کہ انھوں نے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر پھر دجلہ و فرات کے ساحلوں تک دھکیل دیا۔ کیا عجیب بات ہے کہ ایرانیوں پر رومیوں کی حیرت انگیز فتح وکامرانی کا سال (بلکہ بعض روایتوں کے مطابق مہینہ اور دن بھی) بعینہ وہی سال تھا جس میں مسلمانوں کی تین سو تیرہ کی جماعت قلیل کو نوسو سے زیادہ مسلح کافروں کی بھاری تعداد کے بالمقابل بدر کے میدان میں عظیم الشان فتح حاصل ہوئی تھی۔

اب غور کرو قرآن مجید نے غلبۂ روم کی جو پیشین گوئی کی تھی اس میں چند باتیں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہیں۔

(۱) یہ پیشینگوئی حد درجہ ناسازگار حالات میں کیگئی جبکہ رومیوں کی فتح کا بعید سا احتمال بھی نہیں ہو سکتا تھا

(۲) پیشینگوئی میں غلبۂ روم کی کوئی طول طویل مدت مقرر نہیں کی گئی۔ بلکہ صرف نو سال بتائے گئے اور یہ ظاہر ہے کہ رومیوں کو جس شان کی شکست ہوئی تھی اس کے

اعتبار سے قیاس نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ نو برس کی قلیل مدت میں اپنی عظمت رفتہ واپس لے لینگے

(۳) پھر یہ دیکھو کہ رومیوں کو شکست جس سست اور عشرت پسند کمانڈر کے ہاتھوں ہوئی تھی اب یہ فتح بھی اسی کے زیر قیادت ہوئی ہے۔ گویا یہ وہ پہلا ہر قل ہے ہی نہیں۔

(۴) پیشین گوئی کے جو الفاظ ہیں نہایت واضح اور صاف صاف ہیں ان میں کاہنوں اور نجومیوں کی پیشین گوئیوں کی طرح ابہام وخفا یا شک و تردد کی ہلکی سی آمیزش بھی نہیں ہے دیکھو کس محکم جزم و یقین کے ساتھ ارشاد ہے۔

وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ	یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ اللہ اپنے وعدہ کا خلاف نہیں
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ	کرتا۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔

(۵) دنیا جانتی ہے کہ قرآن کی یہ حیرت انگیز پیشین گوئی کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی اور ٹھیک اسی مدت میں جو قرآن نے مقرر کی تھی۔

اب خود سوچو اور بتاؤ کہ کیا قرآن کی یہ پیشین گوئی اور اس کا سچ ثابت ہونا قرآن کے اعجاز کی اور اس کے وحی الٰہی ہونے کی بیّن دلیل نہیں ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اس پیشین گوئی کی صداقت کو دیکھ کر بہت سے کافر مسلمان ہو گئے[۱]

چند اور پیشینگوئیاں | اس خاص پیشین گوئی کے علاوہ قرآن مجید میں اور بھی پیشین گوئیاں ہیں جو بعد میں حرف بحرف پوری ہو کر رہیں۔ تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے کہ جب مسلمان صلح حدیبیہ سے واپس لوٹے تو ان میں ایک عام بددلی پائی جاتی تھی اور وہ اس صلح کو اپنے لئے شکست کے مترادف سمجھتے تھے یہاں تک کہ بعض بعض نے تو صاف لفظوں میں اس کا اظہار بھی کر دیا تھا اس پر قرآن مجید نے یہ مژدۂ جانفزا سنایا۔

---

[۱] ترمذی تفسیر سورۂ الروم

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا — ہم نے تو تمہارے لئے عظیم الشان فتح مقدر کر دی ہے

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ حدیبیہ کی صلح کو شکست نہ کہو بلکہ یہ درحقیقت پیش خیمہ ہے ایک عظیم الشان فتح کا جو فتح مکہ کے نام سے معروف ہے۔ چنانچہ اسی سورۃ میں ارشاد ہے

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ (الفتح)	تم اگر اللہ نے چاہا تو مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے امون و محفوظ کچھ اپنا سر منڈائے ہوں گے اور کچھ بال ترشوائے ہوئے اور تم خوفزدہ نہیں ہو گے

پھر غزوۂ خیبر میں مسلمانوں کو جو مال غنیمت ملا۔ اس کے متعلق پیشینگوئی بھی اس آیت میں پہلے ہی کر دی گئی تھی۔

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ (الفتح)	پیچھے رہ جانے والے اعراب کہیں گے جب کہ تم مالہائے غنیمت کو لینے جاؤ گے کہ ہم کو چھوڑ دو کہ ہم بھی تمہارے پیچھے پیچھے چلیں۔

فتح مکہ اور فتح خیبر کی پیشینگوئیوں سے زیادہ حیرت انگیز وہ پیشینگوئی ہے جس میں مسلمانوں سے تمکن اور استخلاف فی الارض کا وعدہ کیا گیا ہے ارشاد ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ (مومنون)	تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ضرور ان کو زمین میں ایسا ہی خلیفہ بنائیگا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو بنایا ہے اور وہ یقیناً ان کے اس دین کو جس سے وہ (خدا) راضی ہو گیا ہے طاقتور بنائے گا۔

یہ پیشینگوئی اُس وقت کی گئی جب کہ عرب کے دونوں طرف ایران اور روم کی دو زبردست سلطنتیں قائم تھیں اس وقت کسی شخص کو یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ چند برسوں میں ہی ایک وقت وہ آئے گا جب کہ عرب کے بے سروسامان مسلمانوں کی ایک جماعت ان دونوں کو زیر و زبر کر کے رکھ دے گی لیکن اللہ وعدہ کر چکا تھا اس میں تخلف کس طرح ہو سکتا تھا بالآخر دنیا نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پچاس برس بعد ہی مسلمانوں نے ایک طرف ایرانی سلطنت کی پرانی حشمت و شوکت کو ختم کر کے رکھ دیا اور دوسری طرف مشرقی رومن امپائر کے بہت سے صوبوں پر شام سے لے کر موریٹیش کے انتہائی سرے تک قبضہ کر لیا۔ رب العزت نے مسلمانوں سے استخلاف فی الارض کا جو وعدہ کیا تھا وہ نصف صدی میں ہی اسطرح پورا ہوا کہ خلافت عظمیٰ کا دائرہ اقتدار مشرق میں سندھ تک پھیل گیا مغرب میں بحر اٹلانٹک اور شمال میں اس کا پرچم عظمت اناطولیہ کے قلب و جگر پر لہرایا۔

مسلمانوں کی ان حیرت انگیز فتوحات پر تبصرہ کرتے ہوئے گبن صاحب قرآن کی پیشین گوئی کی صداقت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"شاید اب قرآن کی تفسیر آکسفورڈ کے اسکولوں میں پڑھائی جائیگی اور اس کے ممبروں سے مقدس لوگوں کے لئے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وحی کی صداقت اور اس کے تقدس کا اظہار کیا جائے گا۔[۵]"

علاوہ ازیں یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ	ہم نے ہی قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرینگے۔

---

[۵] The Decline and Fall of Roman Empire

فرما کر قرآن کی حفاظت کا۔ اور

وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ — اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا

فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا جو وعدہ کیا تھا وہ کس طرح حرف بحرف پورا ہو کر رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینے کے کیسے کیسے منصوبے باندھے گئے اور کیا کچھ سازشیں نہیں ہوئیں اور پھر آنحضرت مسلح فوجیوں کی حفاظت میں یا کسی مضبوط قلعہ میں بھی نہیں رہتے تھے۔ لیکن چونکہ خدا وعدہ کر چکا تھا اس لئے دشمنوں کی تمام تدبیریں ناکام رہیں اور وہ آپ کا کچھ نہ کر سکے۔ اسی طرح قرآن کو دیکھو اس کو نازل ہوئے چودہ سو برس ہونے کو آئے اور اس کے باوجود اس کا حرف حرف بلکہ اعراب اور علاماتِ آیات تک جوں کی توں محفوظ ہیں اور صرف کاغذوں میں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کے سینوں میں کیا دنیا کی کوئی اور کتاب بھی اسطرح محفوظ ہے؟

اس اخبار بالغیب میں جو قرآن کے وجوہِ اعجاز میں سے ایک وجہ ہے۔ قرآن مجید کے وہ قصص بھی داخل ہیں جو انبیاء کرام علیہم السلام یا دوسری اقوام سے متعلق ہیں اور منافقوں کے دلوں میں چھپے ہوئے ان بھیدوں کی اطلاع بھی داخل ہے جن کا ذکر زیادہ تر سورۂ توبہ میں ہے۔

فصاحت وبلاغت قرآن مجید کے اعجاز کی ایک بڑی وجہ اس کا انتہائی فصیح وبلیغ ہونا ہے۔ اس کی تفصیلات میں اگرچہ اختلافات ہیں، لیکن اجمالاً یہ عقیدہ ہر قرن اور ہر دور میں جمہور امت کے نزدیک مسلم رہا ہے کہ قرآن کی فصاحت وبلاغت کا مثل نہیں لایا جا سکتا۔ قرآن نے خود اپنی فصاحت وبلاغت کا اظہار چند آیتوں میں کیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْہِ اَعْجَمِیٌّ وَّھٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ (نحل) — جس کی طرف یہ کفار نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ قرآن کی زبان نہایت واضح اور صاف عربی ہے۔

قرآناً عربیاً غیرَ ذی عِوَجٍ (زمر) — قرآن عربی زبان میں ہے جس میں کوئی کجی نہیں ہے

قرآنٌ مُّبینٌ — نہایت واضح اور صاف قرآن

بلسانٍ عربیٍ مُّبینٍ — یہ قرآن ایسی زبان میں ہے جو مدعا کو وضاحت سے بیان کرتی ہے۔

فصاحت وبلاغت ذوقی ووجدانی چیز ہے

اس بحث کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ اگرچہ علماء معانی وبیان نے فصاحت وبلاغت اوران کے مدارج ومراتب کی تعین کے لئے بڑی محنت اور تلاش وجستجو سے اصول وقواعد مدون کئے ہیں اوران کی تشریح وتوضیح میں نہایت طول طویل بحثیں کرکے ذہانت وطباعی کی داد دی ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ باعتبار فصاحت وبلاغت دو کلاموں میں موازنہ وترجیح کا کام اہل لسان کے ذوق ووجدان سے ہی متعلق ہے اوراس قضیہ میں ان کے ذوق کا فیصلہ ہی دلیل قاطع کا حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ کتاب الطرازنہ کے مصنف فصاحت کلام پر طویل بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"یہ جو کچھ بھی ہم نے کہا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی لفظ کے حسن تالیف کے فیصلہ کا دارومدار ذوق سلیم اور طبع مستقیم پر ہے قواعد وضوابط پر نہیں جیسا کہ لوگوں نے سمجھا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہی چند حروف ہیں کہ اگر ایک خاص ترتیب سے ان سے ایک لفظ بنایا جائے تو وہ انتہائی غیر فصیح اور رکیک ہوتا ہے لیکن اگر انھیں حروف سے اس ترتیب کو بدل کرکسی اور ترتیب سے ایک لفظ بنایا جائے تو وہ فصیح تر ہو جاتا ہے۔ مثلاً مَلَعَ اور عَلِمَ [۱]"

جب خود اہلِ زبان بلاغت کا ذوق رکھنے میں یکساں نہیں ہوتے تو غیر اہل زبان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قرآن کے وجوہ اعجاز کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

[۱] کتاب الطرازج ۱ ص ۱۰۸ و ۱۰۹

"ازاں جملہ درجۂ علیا از بلاغت کہ مقدور بشر نباشد و چوں مابعد عرب اول آمدہ ایم بکنہ آں نمی توانیم رسید لیکن ایں قدر می دانیم کہ استعمال کلمات و ترکیبات عذبہ جذلہ بالطاف و عدم تکلف قدرے کہ در قرآن می یابم در ہیچ قصیدۂ از قصائد متقدمین و متاخرین نمی یابم و ایں امریست ذوقی کہ مہرۂ از شعرا آنرا بخوبی میتو انند دانست و عوام آں ذائقہ ندارند"[1]

اسی بنا پر امام راغب اصفہانی نے بالکل درست کہا ہے کہ جو لوگ وجدان صحیح اور ذوق سلیم رکھتے ہیں ان کے لئے اعجاز قرآن کی کسی دلیل کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں وہ خود ہی اس کے قائل ہو جاتے ہیں ان کے برخلاف جو لوگ اعجاز قرآن کی دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں وہ دو قسم کے اشخاص ہوتے ہیں ایک وہ جو ناقص ہونے کی بنا پر کلام الہٰی اور کلام بشری میں امتیاز نہیں کر سکتے اور دوسرے وہ جو نقص کے باوجود عنادبھی رکھتے ہیں[2]۔

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا اندازہ ان لوگوں کو ہی ہو سکتا ہے جو سلامت ذوق اور استقامت طبع کے ساتھ عرب کے اساتذۂ شعر و سخن کے کلام کا مطالعہ کئے ہوئے ہوں اور جنھوں نے علم معانی و بیان پر اساتذۂ متقدمین کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اپنے ذوق و وجدان کو پختہ اور شائستہ بنا لیا ہو[3]۔

---

[1] الفوز الکبیر ص ۳۸ [2] کتاب الذریعہ ص ۷۰

[3] ہمارے ہندوستان کے مدارس عربیہ میں ان فنون کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ اس مقصد کیلئے بالکل ناکافی ہیں ان کی جگہ اگر کتب ذیل پڑھائی جائیں تو خاطر خواہ فائدہ ہو سکتا ہے (۱) اسرار البلاغۃ و دلائل الاعجاز امام عبدالقادر جرجانی (۲) کتاب الصناعتین ابو ہلال العسکری (۳) الخصائص ابن جنی (۴) اساس البلاغۃ زمخشری (۵) کتاب الطراز یحیی بن حمزہ (۶) کتاب الفوائد حافظ ابن قیم (۷) مغنی اللبیب ابن ہشام

بلغاء و شعراء عرب پر قرآنی بلاغت کا اثر | جو لوگ اس نعمت خداداد سے بہرۂ وافر رکھتے ہیں وہ خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم بہر حال اس پر مجبور ہیں کہ بلاغت و فصاحت کے اعتبار سے بھی قرآن کے اعجاز کے قائل ہوں۔ چنانچہ تاریخ ادبیات عرب کا مطالعہ کیا جائے تو اس قسم کے صدہا واقعات ملتے ہیں کہ لوگوں نے قرآن مجید کی ایک آیت سن کر ہی اسکے وحی الٰہی ہونے کا اقرار کر لیا ہے۔

عتبہ بن ربیعہ قریش کا بڑا صاحب اثر و رسوخ شخص تھا۔ بدر کی جنگ میں مارا گیا ہے ایک مرتبہ اہل قریش کے ساتھ ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم الگ مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ عتبہ اہل مجلس کے مشورہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ارادہ یہ تھا کہ آپ کو مال وغیرہ کا لالچ دے کر دعوتِ اسلام سے باز رکھنے کی کوشش کرے عتبہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "حٓمٓ تنزیل من الرحمٰن الرحیم" کی سورۃ کا کچھ حصہ تلاوت کر کے سنایا۔ عتبہ نے اپنے دونوں ہاتھ پسِ پشت لیجا کر ان پر ٹیک لگا لی اور نہایت خاموشی سے سنتا رہا سورۃ کی تلاوت کرتے کرتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آیت سجدہ تک پہونچے تو آپ نے سجدۂ تلاوت کیا اور پھر عتبہ سے مخاطب ہو کر فرمایا ابو الولید کیا اب بھی تم اپنے اسی پرانے خیال پر جمے ہوئے ہو؟ عتبہ یہ سن کر اپنے لوگوں میں واپس چلا آیا لیکن قرآن مجید کی آیات کو سننے کا اثر اس کے چہرہ بشرہ سے ظاہر ہو رہا تھا۔ ارباب مجلس نے جب اس سے پوچھا تو کہنے لگا۔ خدا کی قسم میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے کہ اس جیسا آج تک سنا ہی نہیں تھا بخدا یہ کلام ہرگز ہرگز نہ شعر ہے نہ کوئی جادو ہے اور نہ کسی کاہن یا نجومی کا قول ہے" اے قریش والو تم میری بات مانو۔[۱]"

انیس قبیلۂ غفار کے بڑے نامور شاعر تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا سُنکر

---

[۱] شرح زرقانی علی المواہب ج ۵ ص ۹۸۔ ۹۹

چھپے چوری مکہ آئے اور آنحضرتؐ کی زبان مبارک سے قرآن مجید کی کچھ آیتیں سنکر واپس گئے ان کے بھائی حضرت ابوذر نے پوچھا کہ تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسا پایا؟ وہ بولے "لوگ کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں ساحر ہیں یا کاہن ہیں، لیکن میں نے کاہنوں کا کلام سنا ہے اور شعر کے اسالیب وطرق سے بھی واقف ہوں میں نے محمد کے کلام کو ان سب پر منطبق کر کے دیکھا۔ خدا کی قسم وہ ان سب سے بالکل الگ اور ایک اور ہی عجیب طرح کا کلام ہے۔ بخدا محمد سچے اور قریش کے لوگ جھوٹے ہیں[1]"

ولید بن مغیرہ بڑا دولت مند اور قریش میں فصاحت کا امام تھا ایک مرتبہ اس نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر کچھ سنانے کی درخواست کی۔ آنحضرت نے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ والی آیت آخر تک تلاوت فرما کر سنائی۔ ولید اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے مکرر تلاوت کرنے کی فرمائش کی جب آنحضرت دوسری مرتبہ بھی سنا چکے تو ولید بولا "خدا کی قسم اس کلام میں کچھ اور ہی شیرینی ہے اور تازگی بھی نئی قسم کی ہے۔ اس نخل کا اعلیٰ حصہ ثمر آور ہے اور اس کا حصہ زیریں مضبوط تنہ ہے اور کوئی بشر اس جیسا کلام نہیں کر سکتا[2]"

شاہ حبش کے متعلق مشہور ہے ہی کہ جب اس کے دربار میں حضرت جعفر نے سورۂ مریم کی تلاوت کی تو وہ اس درجہ متاثر ہوا کہ بیساختہ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے پھر بولا خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں[3]۔"

قبیلۂ ازد کے ایک شخص ضماد تھے جھاڑ پھونک کا کام کرتے تھے ایک مرتبہ مکہ آئے اور یہاں کے لوگوں سے سنا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) جنون ہو گیا ہے ضماد یہ خیال

---

[1] صحیح مسلم اسلام ابی ذر
[2] شرح زرقانی ج ۵ ص ۱۰۰
[3] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۱۰

کرے کہ میں آپ کا علاج کروں گا۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت نے ان کے سامنے مختصر سی حمد اور کلمۂ شہادت پڑھا، ضماد پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا اور تین مرتبہ آپ سے اس کا اعادہ کرایا اور پھر کہا " میں نے کاہنوں، جادوگروں اور شاعروں ان میں سے ہر ایک کا کلام سنا ہے لیکن آپ جیسے کلمات تو سنے ہی نہیں یہ کلام تو سمندر کی گہرائیوں تک اتر جائیگا اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر بیعت کر لی[۱] "

عمرو بن جموح قبیلۂ بنو سلمہ کے نامی گرامی سردار تھے ان کے بیٹے معاذ اسلام قبول کر کے واپس آئے تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھا کہ تم نے آپ سے کیا سنا ہے معاذ نے سورہ فاتحہ الحمد للہ رب العلمین سے لیکر الصراط المستقیم تک پڑھ کر سنائی عمرو بن جموح پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ کہنے لگے " یہ کلام تو بڑا ہی عمدہ ہے اور خوب ہے کیا آپ کا سب کلام ایسا ہی ہے بولے " جی ہاں! بلکہ اس سے بھی عمدہ " اس کے بعد وہ مسلمان ہو گئے[۲] "

جس زمانہ میں قرآن مجید نازل ہوا عرب کا بچہ بچہ شعر و شاعری کا ذوقِ خداداد رکھتا تھا آتش بیان خطبا قبیلہ قبیلہ میں موجود تھے جو کسی بڑے سے بڑے شاعر و خطیب کے کلام کو نظر میں نہیں لاتے تھے فصاحت و بلاغت کا جوہر ایک ایک شخص کے خمیر میں پڑا ہوا تھا اور وہی ان کے لئے سب سے بڑا سرمایہ نازش و افتخار تھا اب غور کرو فصاحت و بلاغت اور شعر و خطابت کی اس گرم بازاری کے عہد میں مکہ کی خاکِ پاک سے ایک نبی امی کا ظہور ہوتا ہے وہ چالیس سال تک خاموش زندگی بسر کرنے کے بعد یکایک ایک نئے پیغام کی دعوت لے کر اٹھتا ہے اور اس دعوت کی سچائی کے ثبوت میں ایک کلام (قرآن) پیش کرتا ہے اس کلام کو پیش کر کے وہ عرب کے

---

[۱] صحیح مسلم باب الاقتصاد فی الصلوٰۃ والخطبہ

[۲] شرح زرقانی ج ۵ ص ۱۰۲

نامور شاعروں، شعلہ فشاں مقرروں اور خطیبوں اور میدان فصاحت و بلاغت کے شہسواروں کو ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار نرمی اور لین سے نہیں بلکہ نہایت سخت زجر و توبیخ کے انداز میں پھر یکے بعد دیگرے نہیں بلکہ سب کو ایک ساتھ چیلنج دیتا ہے کہ اگر یہ لوگ اس کے دعویٰ کی تکذیب میں سچے ہیں تو سارے قرآن کا نہیں اس کے کسی ایک جزء کا ہی مثل لاکر دکھا دیں۔

پھر کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس نبی امی کی مخالفت اور خصومت میں کیا کچھ نہیں کہا اور کیا گیا لیکن یہ عرب کے نامور خطبا اور شعرا سب مل کر بھی قرآن مجید کی تحدی کے جواب میں اس کی کسی ایک سورۃ کا مثل لاسکے ہرگز نہیں سب کی زبانیں گنگ تھیں اور قوت فصاحت و بلاغت مفلوج پھر جو لوگ ان میں پاک باطن اور صاف سینہ تھے انھوں نے کھلے لفظوں میں اپنی شکست و عجز کا اقرار کیا اور قرآن کے اعجاز بیان سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے شاعری کو ہی خیر باد کہہ دیا۔ لبید عرب کے مشہور شاعر ہیں جن کا ایک قصیدہ سبعۂ معلقہ میں بھی شامل ہے اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ صرف ایک دو شعر منقول ہیں ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ان سے شعر سنانے کی فرمائش کی تو انھوں نے جواب دیا جب خدا نے مجھ کو بقرہ اور آل عمران سکھائی تو اب مجھے شعر کہنا موزوں نہیں [۱] ان کے علاوہ حسان بن ثابت کعب بن مالک عبداللہ بن رواحہ طفیل بن عمر زید الخلیل کعب بن زہیر شماس اسود بن سریع وغیرہم عرب کے نامی گرامی شعرا تھے لیکن قرآن مجید کے دعوی اعجاز کے سامنے سب کی گردنیں خم ہوگئیں اور بجائے مخالف ہونے کے اسلام کے زبردست حامی بن گئے۔

قرآن مجید کے اعجاز بیان کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی صاحب ذوق کے سامنے اسکی کوئی آیت تلاوت کی جائے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کلام کا قائل کون ہے تب بھی لامحالہ سننے والے پر

---

[۱] اسد الغابہ ج ۴ ص ۶۱ و ۲۶۲

اس کا اثر ضرور ہوگا تاریخ اور ادب کی کتابوں میں جستجو کی جائے تو اس قسم کے سینکڑوں واقعات مل سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے ایک شخص سے "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" سنا تو فوراً سربسجود ہو گیا اور بولا "میں نے اس وقت اس کلام کی فصاحت و بلاغت سے ہیبت زدہ ہو کر سجدہ کیا ہے"

ایک اعرابی نے کسی شخص سے قرآن پاک کی آیت فَلَمَّا اسْتَيْأَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا سنی تو بولا "میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی مخلوق اس جیسا کلام بولنے پر قادر نہیں ہے"!

ایک دفعہ عربی لغت کے مشہور امام اصمعی نے ایک کمسن بچی کو دو شعر پڑھتے ہوئے سنا شعر سن کر بولے "اللہ اکبر! یہ شعر کس درجہ فصیح و بلیغ ہیں" لڑکی بولی "کیا اللہ تعالیٰ کے ارشاد

وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ	اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی بھیجی کہ تم اس کو دودھ
فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى	پلاؤ اور جب تم کو اس کے متعلق خوف ہو تو اسے
الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ اِنَّا	دریا میں ڈال دو اور نہ خوف کرو نہ غم ہم پھر
رَادُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ	موسیٰ کو تمہاری طرف لوٹا دیں گے اور اس کو
الْمُرْسَلِيْنَ	رسول بنائیں گے۔

کے بعد بھی کوئی کلام اب اس کا مستحق ہے کہ اسے فصیح کہا جائے۔ تم دیکھتے نہیں کہ اس ایک آیت میں کس خوبی سے اللہ نے دو امر ارضعیہ اور القیہ دو نہی لا تخافی لا تحزنی دو خبریں انا رادوہ اور جاعلو اور دو بشارتیں جمع کر دی ہیں۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں سو رہے تھے کہ اتنے میں روم کی فوج کا ایک کمانڈر انچیف آیا اور کلمۂ تشہد پڑھنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے اس کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ میں نے مسلمان قیدیوں سے ایک قیدی کی زبانی یہ آیت سنی وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ

وَرَسُوْلَہٗ وَیَخْشَ اللّٰہَ وَیَتَّقْہِ الایہ اور اس سے اس درجہ متاثر ہوا کہ آپ کے سامنے اسلام قبول کرتا ہوں[۱]۔"

ان واقعات کے علاوہ صحابہ کرام کے حالات زندگی پڑھو تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید ان پر کیا اثر کرتا تھا حضرت عمرؓ کے متعلق کون نہیں جانتا کہ انھوں نے اپنی بہن فاطمہ سے سورۃ سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سنی تو یہ حال ہوا کہ یا تو سخت غصہ میں بھرے ہوئے تھے اس سورت کو سنتے ہی ان کا حال دگرگوں ہوگیا ایک ایک نقطہ دل پر تیر و سنان کا کام کرتا تھا یہاں تک کہ جب فاطمہ آمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ پر پہونچی تو وہ بے ساختہ پکار اٹھے اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشھد اَنَّ محمداً رسول اللّٰہ

حضرت عثمان بن مظعون نے جب سورہ نحل کی یہ آیت سنی۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	بے شبہ خدا عدل اور احسان اور قرابتداروں
وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ	کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اور
الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ	بدکاری اور بری باتوں اور ظلم سے روکتا ہے
لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ	تاکہ تم اس سے نصیحت پذیر ہو۔

تو انھوں نے فرمایا "اب اس وقت میرے دل میں ایمان جاگزین ہوگیا اور میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے لگا[۲]۔"

حضرت جبیر بن مطعم اسیران بدر کو چھڑانے آئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سورۂ طور کی چند آیتیں سنی تو ان کا دل اڑنے لگا[۳]" حضرت طفیل بن عمرو دوسی کے

---

[۱] یہ سب واقعات شرح زرقانی ج ۵ ص ۱۰۳ و ۱۰۴ سے ماخوذ ہیں

[۲] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۳۱۸ [۳] صحیح بخاری تفسیر سورۂ طور

کانوں میں اتفاقیہ قرآن کی چند آیتیں پہونچ گئیں تو حلقہ بگوش اسلام ہو گئے[۱] حبش سے بیس
آدمیوں کی ایک جماعت خدمت اقدس میں حاضر ہوئی آپ نے ان کو قرآن مجید کا ایک حصہ
پڑھ کر سنایا تو ان کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے[۲] طائف کے سفر میں حضرت خالد العدوانی
نے آپ کی زبان سے

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ — آسمان کی قسم اور رات میں آنے والے کی قسم

سنی تو اسی وقت پوری سورۃ دل میں اترتی چلی گئی اور آپ مسلمان ہو گئے[۳]

افراد و اشخاص کا کیا ذکر ہے صحابہ کی تو جماعت ہی قرآن مجید کے اثر سے متاثر ہوئی
حضرت ابو عبیدہ حضرت ابو سلمہ اور حضرت ارقم بن ابی ارقم اسی کتاب الہٰی کی مقناطیسی کشش
سے کھنچکر اسلام لائے تھے[۴]

پھر اسلام لانے کے بعد بھی صحابہ کا یہ حال تھا کہ ایک ایک آیت پر کلام الہٰی کی ہیبت
سے آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جو خود حاملِ وحی تھے بسا اوقات
کسی کی زبان سے قرآن مجید سن کر رونے لگتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود
نے قرات شروع کی تو چشم مبارک سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔

قرآن کی یہ معجزانہ فصاحت و بلاغت ان لوگوں کو بھی متاثر کئے بغیر رہی جو اہلِ زبان

---

[۱] طبقات ابن سعد تذکرۂ طفیل بن عمر والدوسی

[۲] سیرۃ ابن ہشام

[۳] مسند امام احمد بن حنبل ج ۴ ص ۳۳۵

[۴] اسد الغابہ تذکرہ ابوسلمہ

نہ تھے اور ساتھ ہی غیر مسلم بھی تھے ڈاکٹر ٹیلر، موسیو سدیو، گبن، ڈیون پورٹ، ٹالسٹائی۔ کارلایل ہنری دی کاستری۔ راڈویل ان لوگوں نے بھی قرآن مجید کے اسلوب بیان اور اس کی تاثیر و تسخیر کا اعتراف صاف لفظوں میں کیا ہے[ا]۔

ژان ژاک روسو نے اپنی ایک تحریر میں قرآن مجید کی تاثیر اور اس کے اعجاز کا ذکر ایک عجیب پیرایہ میں کیا ہے جو آج کل کے بعض مدعیان عربی داں پر پورے طور پر صادق آتا ہے وہ لکھتا ہے:-

"بعض لوگ ہیں جو عربی برائے نام ہی جانتے ہیں وہ جب قرآن پڑھتے ہیں تو ہنسنے لگتے ہیں، لیکن اگر اس قسم کے لوگوں کو اس بات کا موقع مل جاتا کہ وہ براہِ راست محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس حد درجہ اثر انگیز اور دلوں میں گھر کرنے کی والی زبان کو سنتے تو بے شبہ یہ لوگ زمین پر سجدہ میں گر پڑتے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پکار کر کہتے کہ "اے نبی" آپ ہمارا ہاتھ پکڑ لیجئے، پھر آپ کا جہاں جی چاہے ہم کو لے چلئے۔ خواہ شرف و مجد کی طرف یا خطروں اور ہلاکتوں کی جانب ہم تو اب آپ کی وجہ سے موت کو بھی محبوب رکھنے لگے ہیں۔

عدم اختلاف قرآن نے اپنے اعجاز کی ایک دلیل عدم اختلاف و تناقض کو بھی بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا	اگر قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔

عام مصنفین کی بڑی بڑی اہم تصنیفات سے قطع نظر یہ دیکھو کہ دوسرے مذاہب کی

[ا] دیکھو تفصیل کے لئے اسلام والحضارۃ العربیہ جلد اول اور ادب العرب

[۲] بحوالہ الاسلام والحضارۃ العربیہ ج ا ص ۶۹

خود الہامی اور آسمانی کتابوں کا کیا حشر ہوا؟ ایک اڈیشن دوسرے اڈیشن سے مختلف ہے لیکن قرآن نے اپنی صداقت میں جس دلیل کو پیش کیا تھا وہ دشمنوں کی ہزار کوششوں کے باوجود آج تک آفتاب نیم روز کی طرح روشن و ظاہر ہے تقریباً تیس تیئیس برس پہلے ڈاکٹر منگانا نے قرآن مجید کے کسی نئے نسخے کے ملنے کی اطلاع سے دنیا میں ایک تہلکہ برپا کر دیا تھا لیکن باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ مصر اور ہندوستان کے علماء نے کس طرح ڈاکٹر صاحب کے بے بنیاد دعویٰ کو باطل محض کر دکھایا تھا

احکام و شرائع | خود قرآن کے بیان کے مطابق اس کے اعجاز کی ایک وجہ اس کے تشریعی احکام و مسائل ہیں قرآن نے بار بار اپنے آپ کو ہدایت نور۔ دلیل روشن۔ رحمت بصیرت اور حجت کہا ہے غور کرو قرآن مجید کے اعجاز کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ چالیس سال کی خاموش زندگی کے بعد یکایک ایک امی ایک صحیفہ مقدس لئے ہوئے دنیا کے سامنے ظاہر ہوتا ہے اور اس صحیفہ سے وہ جاہلوں کو دانشوران روزگار اور اونٹ چرانے والے بدویوں کو بہترین تہذیب و تمدن اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ کا پیکر اتم بنا دیتا ہے۔ اصول اخلاق و قانون حکمت و فلسفہ اور محاسن علم و عمل کی بزم کا گوشہ گوشہ اس کے پرتو قدس سے بقعۂ نور بن جاتا ہے۔

قرآن کا محکم دستور العمل | جو قوانین و ضوابط قرآن نے پیش کئے وہ اس قدر صحیح اور مکمّل ہیں کہ آج علوم و فنون کی بڑی گرم بازاری اور انسانی عقل و خرد کی حیرت انگیز ترقی و بلند پروازی کے باوجود معاشرت تہذیب و تمدن نکاح و طلاق۔ بیع و شرا تقسیم میراث اور عام معاملات و اخلاق کے قوانین قرآنی قوانین کے مقابلہ میں سالہا سال کے تجربوں کے بعد ناکام ہی ثابت ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ دوسری قوموں کو جب کبھی اپنی سوشل اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنی پرانی مزعومہ یا اصلی روایات مذہبی کو چھوڑ کر اسلام کے احکام و قوانین کے دامن ہی میں پناہ لی ہے۔

اس پر اگر تفصیل سے کلام کیا جائے تو ایک مستقل کتاب درکار ہے مجملاً اسقدر لکھدینا کافی ہوگا کہ

یورپ نے بہت دنوں تک طلاق کا مذاق اڑایا۔ تعددِ ازدواج پر طعنہ زنی کی اور مسلمانوں کے جہاد کو وحشت اور بربریت کہا۔ مگر آخرکار اس کو خود طلاق کا قانون وضع کرنا پڑا۔ پھر یہ دیکھو کہ اسلام نے طلاق کا اختیار مرد کو دیا تھا نہ کہ عورت کو۔ کیونکہ عورت فطرتاً بہت زود رنج اور جلد متاثر ہو جانے والی ہے۔

یورپ والوں نے طلاق کو مشروع تو کیا لیکن غلطی یہ کی کہ اس کا اختیار عورت کو دیدیا گویا پہلے یہ لوگ تفریط میں مبتلا تھے اور اب افراط میں مبتلا ہو گئے۔ اس کا جو کچھ بھی نتیجہ ہوا آج ہر باخبر شخص اس سے ناواقف نہیں ہے کہ طلاق کی کثرت نے کس طرح ان لوگوں کی معاشرتی زندگی ویران و تباہ کر رکھی ہے

ہندوؤں میں عقد بیوگان کا رواج نہیں تھا۔ مذہبی اعتبار سے وہ اسے بہت بڑا پاپ سمجھتے تھے۔ لیکن جب اس ممانعت نے ان کی سوسائٹی میں چند در چند اخلاقی معائب پیدا کر دئے اور ان کو اپنی اصلاح کا خیال ہوا تو انجام کار انھیں وہی کرنا پڑا جس کا اعلان اب سے ساڑھے تیرہ سو سال سے بھی زیادہ مدت پہلے ایک نبی امی کی زبان سے ہو چکا تھا۔ یہی حال میراث کا ہے۔ ہندوؤں میں بیٹی کو ترکہ پدری سے کوئی حصہ نہیں ملتا تھا لیکن اب جن ہندو ریاستوں میں سماجی اصلاح کی کوششیں ہو رہی ہیں وہاں برملا کہا جا رہا ہے کہ بیٹی کو بھی حصہ ملنا چاہیئے اب اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ قانون قرآنی کے متناسب و متوازن ہونیکا یہ عالم ہے کہ وہ بیٹی کو باپ کے ترکہ میں سے حصہ دلاتا ہے لیکن بیٹے سے نصف اس میں حکمت یہ ہے کہ بیٹے کو کسب معاش کے لئے کارگاہ زندگی میں تگ و دو کرنی پڑتی ہے اور تمام بار اس کو ہی اٹھانا پڑتا ہے، رہی بیٹی تو اس کو کمانے کے لئے خود کچھ نہیں کرنا پڑتا بلکہ اس کا نان نفقہ شادی کے بعد شوہر کے ذمہ ہوتا ہے۔

یورپ نے تعدد ازدواج پر کیا کچھ لعن طعن نہیں کیا لیکن اب خود وہاں کے بڑے بڑے حکما اور مفکرین تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام میں تعدد ازدواج کی اجازت بہت سے اخلاقی فواحش و مفاسد کے انسداد کا کامیاب ذریعہ ہے اسی طرح یورپ نے "جہاد" کو وحشت اور درندگی کہا۔ لیکن اب دیکھو کہ خود

یورپ میں کیا ہو رہا ہے کیا اس نے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اب دبی زبان سے یورپ نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ جب تک دنیا فتنہ و شر اور خواہشات نفسانی و اغراض فاسدہ کی آماجگاہ ہے کسی حق کی حفاظت کیلئے تلوار سے کام لینا ناگزیر ہے۔ البتہ ہاں فرق اسقدر ضرور ہے کہ قرآن میں جس جنگ کا حکم ہے وہ وہی جنگ ہے جو حق کی حمایت وحفاظت کے لئے لڑی جائے نسلی اور قومی عصبیت کی برتری قائم رکھنے کیلئے جنگ نہ صرف یہ کہ جائز نہیں ہے بلکہ بڑی معصیت ہے اور یہاں انجیل کے پیرو جو کچھ کر رہے ہیں وہ محض اپنی قومی فوقیت کو برقرار رکھنے اور دوسرے ملکوں اور قوموں کو اپنے دام حکومت میں پھنسانے کے لئے کر رہے ہیں پس غور کرو کہ کیا یہ قرآن کا اعجاز نہیں ہے کہ وہ جو دستور العمل اور نظام زندگی پیش کرتا ہے وہ ایسا جامع محکم اور ناقابل تغیر و تبدل ہے کہ صدیوں کے گذر جانے اور عقل و فکر کی حیرت انگیز ترقی کے باوصف اسکی کسی ایک دفعہ میں بھی کوئی ترمیم و تنسیخ نہیں ہو سکتی اور اس بنا پر مسلمان اس بات کے محتاج نہیں ہیں کہ اپنی کسی سوشل اصلاح کیلئے وہ کسی دوسرے قانون و نظام سے دریوزہ گری کریں تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کسی جماعت نے قرآن کے دستور سے منحرف ہو کر کسی قوم کی نقالی کی اس نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں اسکے برعکس دوسری قوموں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی کی اصلاح کیلئے جب کبھی غور و فکر سے کام لیتی ہیں انھیں مجبوراً اپنی دیرینہ روایات مذہبی و سماجی کو پس پشت ڈالکر اسلام کے دستور سے ہی بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ پس کیا کوئی طاقت ہے جو قرآن کے دعویٰ

کِتَابٌ اُحْکِمَتْ آیَاتُہٗ — ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں مضبوط ہیں

اور جَعَلْنَاہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَاءُ — ہم نے اسکو نور بنایا ہے کہ جو چاہتے ہیں اسکے ذریعہ سے راستہ دکھاتے ہیں

کی ذرا بھی تکذیب و تغلیط کر سکے" سورۂ قصص میں قرآن مجید اپنی اس حیثیت کو بطور تحدی اسطرح بیان کرتا ہے

قُلْ فَاْتُوْا بِکِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ ھُوَ اَھْدٰی مِنْھُمَآ اَتَّبِعْہُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ — کہدیجئے اے محمدؐ تم اللہ کے پاس سے کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو ان دونوں (قرآن اور توراۃ) سے زیادہ ہدایت دینے والی ہو میں اسکا اتباع کرونگا اگر تم سچے ہو

قرآن کی روح سے تشبیہ | جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید سراپا نور اور حسن و جمال ہے سطور بالا میں جو چند وجوہ اعجاز بیان کئے گئے ہیں وہ صرف اس کے ایک رخ پرنور کی ناتمام سی تشریح کرتے ہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کو ایک مقام پر روح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (زخرف)

اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے آپ پر روح کو بطور وحی نازل کیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح روح ایک حقیقت ثابتہ ہے اسکے افعال و آثار ہر شخص پر عیاں ہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ مادی اور جسمانی زندگی کا قیام روح کے اتصال بالجسم پر موقوف ہے لیکن اسکے باوجود آج تک روح کی حقیقت و ماہیت متعین نہیں کی جا سکی اسی طرح قرآن مجید اخلاق و حسن عمل کی روح ہے اس پر عمل کرنے کے بعد ہر شخص اس کے اثرات و نتائج بین طور پر محسوس کر سکتا ہے لیکن بایں ہمہ کوئی شخص اس کی پوری حقیقت و کنہ سے واقفیت حاصل نہیں کر سکتا۔

حضرت علیؓ کا ارشاد | حضرت علیؓ نے قرآن مجید کی نسبت ایک نہایت بلیغ کلام کیا ہے ہم وجوہ اعجاز کی بحث کو اس پر ہی ختم کرتے ہیں۔

"قرآن علماء کی پیاس کے لئے سامان سیرابی ہے اور فقہا کے دلوں کے لئے فصل بہار وہ صلحا کے لئے ایک جادۂ مستقیم ہے اور ارباب بحث و نظر کیلئے برہان قوی وہ طلبۂ علوم کیلئے علم کا انمول خزانہ ہے ارباب حکومت کے واسطے ایک محکم دستور اساسی' وہ اصحاب روایت کے لئے حدیث جانفزا ہے اور تشنگان تحقیق و جستجو کے لئے امید و رجا کا سب سے بڑا سہارا (نہج البلاغۃ)

حق کی حجت تمام ہو چکی' اب اس پر بھی اگر کوئی سرگشتہ وادی ضلالت و گمرہی ہدایت کی روشنی نہیں پاتا تو نہیں کہا جا سکتا کہ

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ

اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے[1]

قرآن مجید کا اسلوب بیان اور بعض عیسائی مصنفین

کتاب کے آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض ان اعتراضات اور ان کے جوابات کا بھی ذکر کر دیا جائے جو بعض عیسائی مصنفین نے قرآن پر کئے ہیں ان لوگوں کا ایک عام اعتراض یہ ہے کہ نزولِ قرآن سے پہلے عرب میں بعض پرزور خطیب مثلاً قس بن ساعدہ اور شعراء مثلاً امیۃ بن الصلت ایسے موجود تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے ان کے خطبے اور اشعار سنے تھے اور ان لوگوں کے کلام میں بعض چھوٹے چھوٹے فقرے قرآن کی چھوٹی چھوٹی آیتوں کے انداز کے پائے جاتے ہیں، عیسائی مصنفین اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کا اسلوب انھیں سے لیا ہے۔

قس بن ساعدہ کے خطبات اور امیہ بن الصلت کے اشعار عربی ادب و محاضرات کی کتابوں میں بکثرت منقول ہیں انکی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے یہاں ان کے نقل کرنیکی ضرورت نہیں۔

اس اعتراض کے جواب میں سب سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیئے کہ قس بن ساعدہ اور امیۃ کے جن اشعار کو پیش کر کے قرآن مجید کے اسلوب پر اعتراض کیا جاتا ہے انکی نسبت تحقیق یہ ہے کہ وہ سب موضوع ہیں۔ اس بنا پر وہ نزولِ قرآن سے پہلے کا نہیں بلکہ بعد کا کلام ہے اصل یہ ہے کہ بنو امیہ اور عباسیہ کے عہد میں کچھ ایسے لوگ تھے جو خلفاء و امراسے بیش از بیش انعام حاصل کرنے اور بعض دوسری اغراض کیلئے از خود کلام گھڑ گھڑ کر شعراء و خطباء جاہلیت کیطرف اسے منسوب کر کے سنا دیتے تھے ان وضاعین میں حماد الروایۃ اور خلف بن حیان الاحمر زیادہ مشہور ہیں ایک مرتبہ ولید بن یزید نے حماد سے پوچھا "تمہیں کتنے اشعار یاد ہیں بولا بہت زیادہ اگر آپ سننا چاہیں تو ایک نشست میں ہی ہر ہر حرف تہجی کے سو سو طویل قصیدے صرف شعراء جاہلیت کے سنا سکتا ہوں" ظاہر ہے کہ حماد کا یہ عجیب و غریب دعویٰ خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شعراء جاہلیت کیطرف منسوب کر کے جو اشعار سناتا تھا ان میں بہت کچھ اسکے خود ساختہ و پرداختہ اشعار بھی شامل ہونگے چنانچہ اصمعی نے ایک مرتبہ کہا "حماد اعلم الناس ہے اگر وہ اشعار میں کمی بیشی نہ کرے" علامہ یاقوت الحموی لکھتے ہیں کہ

اصمعی نے یہ اس لئے کہا کہ حماد کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ وہ شعر از خود کہتا ہے اور پھر شعرا عرب کی طرف اسے منسوب کر دیتا ہے[۵۱]، مفضل الضبی کا قول ہے "شعر پر حماد کی وجہ سے ایسی آفت ٹوٹی ہے جس کی کبھی اصلاح نہیں ہو سکتی یہ شخص قدیم شاعروں کے محاورات انداز بیان اور ان کے لغات و اسلوب ادا سے پوری طرح واقف تھا اس لئے ان کے ہی طرز میں شعر کہکر انکی طرف منسوب کر دیتا تھا اور سوائے ماہر فن نقاد کے عام لوگوں کو امتیاز نہیں ہو سکتا تھا کہ اس قصیدہ میں کتنے شعر شاعر کے ہیں اور کتنے خود حماد کے کہے ہوئے ہیں[۵۲]" ۱۵۵ھ میں انتقال ہوا۔

یہی حال خلف الاحمر کا تھا، اس کا باپ ابو بردہ بلال بن ابی موسی الاشعری کا غلام تھا، اشعار کے وضع میں یہ حماد کا ہم پایہ تھا۔ کتاب "ابناء الرواۃ" میں ہے کہ یہ شخص اتنا بڑا حاذق اور ماہر لغت و ادب تھا کہ اپنے اشعار شعرا جاہلیت کے نام سے پڑھ کر سنا دیتا تھا اور بڑے بڑے زباں دانوں کو یہ محسوس نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ اشعار خود اس کے طبعزاد ہیں، ابو الطیب عبد الواحد اللغوی کا بیان ہے

كَانَ خَلَفٌ يضع الشعر و يَنسُبُهُ	خلف اشعار وضع کرتا تھا اور انھیں عرب کی طرف
إلى العرب فلا يُعرَفُ[۵۳]	منسوب کر دیتا اور (لطف یہ ہے) اسکا پتہ نہیں چلتا تھا

ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ چونکہ قرآن نے اپنی غیر معمولی فصاحت و بلاغت کے باعث تمام عرب کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔ بچہ بچہ کی زبان پر قرآن کی آیتیں تھیں جنھیں بے تکلف بول چال اور تقریر و خطابت میں استعمال کر کے اپنے کلام کو مزین کرتے تھے۔ انداز خیال۔ اسلوب بیان اور طرز کلام و گفتگو سب قرآن مجید کے نظم کلام سے متاثر تھے اس بنا پر یہ قیاس کرنا بالکل صحیح ہے کہ حماد الراویۃ اور خلف الاحمر ایسی وضع و قماش کے لوگ اپنے جن نتائج فکر کو قدیم شعراء عرب کی طرف منسوب کرتے تھے

---

۵۱ معجم البلدان ج ۱۰ ص ۲۶۵ جدید اڈیشن ۵۲ ایضاً ص ۲۶۵، ۲۶۶

۵۳ معجم البلدان ج ۱۱ ص ۶۸

ان میں قرآن مجید کے اسلوبِ بیان کی جھلک اضطراری یا اختیاری طور پر نمایاں ہوجاتی تھی۔ ہم تمثیلاً تین شعر نقل کرتے ہیں جو بالعموم امیۃ بن الصلت کی طرف منسوب ہیں۔ انھیں پڑھو اور غور کرو، صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید سامنے رکھ کر یہ اشعار تصنیف کئے ہیں۔

فقلت لہٗ اذھب بھارون فادعوا — الی اللّٰہ فرعون الذی کان طاغیاً

وقولا لہٗ انت رفعت ھٰذہ — بلا عمدٍ ارفق اذا بک بانیا

وقولا لہٗ انت سوّیت وسطھا — منیراً اذا ما جنّہ اللیل ھادیا

ان اشعار کے ساتھ قس بن ساعدۃ کے خطبہ کا ایک ٹکڑا بھی ملاحظہ فرمایئے کہتا ہے[۱]

"نبیًا قد حان حینہٗ واظلکم اوانہٗ فطوبیٰ لمن آمن بہ فھداہ وویلٌ لمن خالفہٗ وعصاہ"

جو لوگ زبان عربی کا ذوق رکھتے ہیں وہ فوراً محسوس کرلیں گے کہ اس عبارت میں جو الفاظ قرآن مجید کے آگئے ہیں ان کا دوسرے الفاظ کے ساتھ جوڑ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ٹاٹ میں مخمل کے کسی ٹکڑے کا پیوند اور اس بنا پر پوری عبارت صاف بتا رہی ہے کہ یہ نزولِ قرآن سے پہلے کی نہیں بلکہ بعد کی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ پروفیسر مارگولیوتھ اس قسم کے معترضین میں سب سے پیش پیش ہیں مگر ایک جگہ خود انھیں بھی اعتراف ہے کہ "قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موضوع کیا گیا ہے[۲]۔"

اشعار موضوعہ کی تنقید جس طرح مسلمانوں میں بعض شریر النفس لوگوں کی کوششوں سے احادیث موضوعہ کا چرچا ہوا تو ارباب فن نے ان کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا اور ایک ایک لفظ اور ہر ایک راوی پر ایسا نقد و جرح کیا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگیا۔ اسی طرح اس قسم کے من گھڑت اشعار

[۱] اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ للسیوطی ج ۱ ص ۸۰ مطبوعہ مصر [۲] بحوالہ سیرۃ النبی ج ۱ حاشیہ صفحہ ۱۸۳

اور خطبے شعراء و خطبا قدیم کی طرف منسوب ہو کر مسلمانوں میں پھیلنے شروع ہوئے تو اگرچہ عوام اصلی اور نقلی میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اصحاب ذوق اور علماء شعر و ادب اس فریب میں نہیں آسکتے تھے انھوں نے علماء جرح و تعدیل کی طرح ان موضوع اشعار و قصائد کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا اور جس میں جہاں کہیں رخنہ نظر آیا اسے برملا ظاہر کیا۔ چنانچہ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں اور جلال الدین سیوطی نے اللآلی المصنوعہ میں اس نوع کے اشعار و خطبات متعدد مواقع پر نقل کر کے ان پر تنقید کی ہے اور ان کے موضوع ہونے کا پردہ چاک کیا ہے ان کے علاوہ عربی ادب کی تنقیدی کتابوں میں بھی اس طرح کے مقولے اور اقوال بکثرت مل سکتے ہیں۔

پھر اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر عیسائی مصنفین کا یہ اعتراض کسی درجہ میں بھی درخور اعتنا ہوتا تو اس کی طرف سب سے پہلے توجہ ان کفار و مشرکین کو ہوتی جو انتہائی عالم بے بسی و بیکسی میں قرآن پر حرف گیری کرنے کے لئے تنکے کا سہارا ڈھونڈھتے تھے تو پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ جو لوگ اہلِ زبان تھے شعراء جاہلیت کا کلام جن کے ایک ایک بچہ کی زبان پر تھا اور جو عربی زبان کے اسالیب بیان سے واقف ہونے کے باعث شعراء عرب پر بہترین تنقید کر سکتے تھے ان کے حاشیۂ خیال میں تو یہ بات کبھی بھی نہیں آئی کہ قرآن مجید کا اسٹائل شعراء و خطباء جاہلیت کے اسٹائل سے ماخوذ ہے اور وہ عیسائی مصنفین جن کا ذوقِ عربیت اور مسلمانوں کے فن روایت سے ان کی واقفیت برائے نام ہی ہے وہ اس بے سر و پا اعتراض کی جرأت کرتے ہیں سبحان اللہ

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمۂ و ناز

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست